جلد ۲ | نمبر ۶
ماہ دسمبر سنہ ۱۹۴۱ء
ماہ جنوری سنہ ۱۹۴۲ء
چندہ سالانہ صہ

اپنی باتیں

سنہ ۱۹۴۱ء کا یہ آخری پرچہ ہے۔ جو ٹیگور نمبر کے بعد شایع ہو رہا ہے ٹیگور نمبر کے متعلق ناظرین نے جس ہمت افزائی کا کام لیا ہے وہ ہمارے لئے باعث فخر ہے اور اسکا شکریہ ادا نہ کرنا ہمارے لئے اخلاقی جرم ہوگا۔

اس سلسلے میں ہمارے پاس بہت زیادہ مضامین آچکے تھے جن میں سے بعض ہم اشاعت میں شایع ہو رہے ہیں اِس نمبر کی ترتیب کچھ ایسی پریشانیوں اور الجھنوں کے دوران میں ہوئی ہے جس کا اندازہ کچھ وہی حضرات کر سکتے ہیں جنکو ایک انارد صد بیمارے سے دوچار ہونا پڑا ہو۔ کاغذ کی گرانی کے ساتھ ساتھ کمیابی۔ اور پھر ادارے کی پریشانیاں۔

ایسی باتیں ہیں جنہوں نے ہماری دشواریوں میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ بہر نوع اضطراب حاضر خدمت ہو رہا ہے۔ ہم نے تابمقدور کوشش کی ہے کہ یہ نمبر بھی سابق نمبروں کی طرح اپنی خوبیوں کا حامل ہو۔

"غلط فہمی" کے عنوان سے مولوی شمس الدین حیدر صاحب شمیم کرمانی کی ایک کہانی شایع ہو رہی ہے جو انہیں کے الفاظ میں ایک ہندی کہانی کا آزاد ترجمہ ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ ترجمے کا کام اہم ہونیکے ساتھ ساتھ دشوار بھی ضرور ہے جیسا کہ خود اُن کا خیال ہے۔ مگر ہماری رائے ناقص میں ہندی سے اردو میں ترجمے کرنا ایسا دشوار کام نہیں ہے اسلئے کہ دراصل یہ تو دونوں زبانیں ایک ہی ہیں خصوصاً افسانوں کی زبان۔

افسانوں کے متعلق گذارش ہے کہ آئندہ ہم زیادہ تر طبع زاد افسانے شائع کرنیکا ارادہ رکھتے ہیں۔ تراجم میں صرف مرہٹی۔ گجراتی اور اسی قسم کی دوسری زبانوں کے ترجمے شایع کرنا چاہتے ہیں جن سے اردو کا دامن ابھی خالی ہے۔ بنگالی میں قاضی ندر… قاضی جسیم الدین۔ شانتا دیوی۔ شرت چند چٹرجی وغیرہ جیسے مشہور و معروف شعرا اور افسانہ نگاروں کے تراجم بہت خوشی سے شایع کئے جائیں گے۔ ٹیگور انجہانی کے کسی افسانے یا نظم وغیرہ کا ترجمہ شایع کرنیکی ضرورت نہیں سمجھی جا رہی ہے۔

اسی طرح ہم ہندی کے تراجم بھی شایع کرنا نہیں چاہتے۔

تنقیدی اور علمی مضامین کا سلسلہ بھی جاری رہیگا اور مزید خوبیوں کیساتھ۔ اس باب میں عرض ہے کہ مضمون نگار حضرات شعر و شاعری پر لکھنے کے بجائے نثر نگاری پر لکھیں تو بہتر ہوگا۔ ہمارے نثر نگار حضرات بہت کچھ پردہ خفا میں پڑے ہیں جنکو اجاگر کرنا ہمارا فرض ہے۔ سرشار۔ سجاد حسین۔ حکیم محمد علی۔ شرر۔ راشد الخیری وغیرہ کی ہستیاں ایسی ہیں کہ انکو ہم لوگ اتنی جلد بھول جاتے اور ابتک ان کے متعلق مستقل طور پر ایک کتاب بھی شائع نہ کرتے۔

اسی طرح حصۂ نظم میں بھی آپ کو ایسے شعراء کا کلام ملیگا جنکا کلام ظاہری اور معنوی خوبیوں سے مالامال ہے۔

آئندہ ہمارا یہ بھی ارادہ ہے کہ ہم فانی مرحوم و مغفور کی یادگار میں فانی نمبر نکالیں اور اسکے بعد مرحوم عظیم بیگ کی یادگار میں چغتائی نمبر۔ فانی نمبر کیلئے سر دست جو خاکہ ہمارے پیش نظر ہے وہ قارئین کرام کے سامنے رکھتا ہوں اور مضمون نگار حضرات سے باادب استدعا ہے کہ وہ ہماری ضروریات پوری کر کے ممنون فرمائیں۔ خاندانی حالات۔ تعلیم و تربیت۔ زندگی کے دیگر واقعات۔ فانی کا کلام۔ فانی اور زندگی کا فلسفہ۔ فانی اور محبت۔ فانی اور میر۔ باقیات فانی۔ وجدانیات فانی۔ عکس تحریر اور دیگر تصاویر۔ وغیرہ وغیرہ۔

ہم نے نقد و نظر کیلئے مستقل طور سے ادارہ تنقید بھی بنا لیا ہے جو کئی حضرات پر مشتمل ہے اور وہ اعزازی طور پر یہ خدمت انجام دیتے رہیں گے۔ اسلئے ناشرین اور حضرات مصنفین سے گذارش ہے کہ وہ جس کتاب یا رسالے پر تنقید چاہیں اسکی دو جلدیں ہمارے یہاں روانہ فرما دیں۔ اور پتے پر ادارہ تنقید "اضطراب" تحریر فرما دیں۔

نقد و نظر

الاصلاح کا عید نمبر: الاصلاح بمبئی کا ہفتہ وار اخبار ہے اور اسکا عید نمبر ۲۶×۲۰ ۱/۸ سائز پر شائع ہوا ہے۔ رسالہ اپنی ظاہری اور معنوی خوبیوں کے اعتبار سے نہایت عمدہ اور خوبصورت ہے۔ رسالے کے تین حصے ہیں جو اردو، انگریزی اور گجراتی زبان پر مشتمل ہیں، انگریزی اور گجراتی کے مضامین ضمنی ہیں۔ اقبال حسین صاحب آرٹسٹ نے عہد مغلیہ کی نقاشی اور چند دیگر تصاویر نہایت کامیابی سے تیار کی ہے اقبال صاحب کی عکسی جمیلہ یقیناً قابل صد تحسین ہیں۔ اسی سلسلے میں جناب طیب جی صاحب کا انگریزی مضمون میں نقاشی اور اسکا ماخذ نہایت قابل قدر اور عالمانہ ہے۔ اردو مضامین کے سلسلے میں تمام علمی ادبی اور تحقیقی مضامین نیز افسانے وغیرہ نہایت کامیاب اور عمدہ ہیں نظمیں بھی نہایت عمدہ اور قابل قدر ہیں گجراتی حصے میں ساہتیہ کا بھلا (ادب میں آرٹ) جو مسٹر ایم۔ ڈی۔ ڈیسائی کے ایک مضمون کا ترجمہ ہے۔ گناہگار دست و زیر صاحب کی کی ایک کہانی اور جگتنی پرتھم وارتا (ابتدائی دنیا کی حالت) نہایت عمدہ مضامین ہیں۔ ہم ایڈیٹر صاحب اور ادارہ الاصلاح کو اس شاندار کامیابی پر ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں اور اردو کے بہی خواہ حضرات سے اسکے پڑھنے کی استدعا۔ رسالے کی قیمت صرف ۸ ہے جو اسکی تصاویر اور کاغذ کی عمدگی...

بہن: یہ محبوب دکنی صاحب کا افسانہ ہے جو پاکٹ سائز پر نہایت عمدہ کاغذ پر شائع ہوا ہے قیمت صرف ۸ ہے اور شمس المطابع حیدرآباد دکن میں طبع ہوا ہے۔ جناب ماہر القادری صاحب کا پیش لفظ ہے۔ دکنی صاحب نہایت نوخیز افسانہ نگار ہیں غالباً انکا پہلا افسانہ ہے۔ افسانے کے متعلق قادری صاحب نے اپنے پیش لفظ میں بہت کچھ لکھ دیا ہے ہم نے صرف اسکی سیرت نگاری پر ایک سرسری نظر ڈالی ہے محبوب صاحب اس میں کامیاب نظر آتے ہیں ہمیں امید ہے کہ دکنی صاحب آئندہ اردو ادبیات میں ایک عمدہ قسم کے افسانوی ادب کا اضافہ کریں گے۔

ہم دست بدعا ہیں۔ ع   اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

"ادارہ"

غزل

(۱)

جز عشق معتبر یہ کسی کو خبر نہیں — ایسا بھی حسن ہے جو یہ قید نظر نہیں

سنجیدگی ہزار ہو غم سے مفر نہیں — دریا ابھی ہیں بند جو آنکھ تر نہیں

جو ہم نفس کیساتھ نہ لائے پیام دوست — ہرگز وہ میری شام وہ میری سحر نہیں

وہ کون سا ہے جلوہ مکرر کہیں جسے — وہ کونسی نظر ہے جو پہلی نظر نہیں

یہ شرمگیں نگاہ، یہ انکارِ مضمحل — پھر کیا ہے اعترافِ محبت اگر نہیں

طولِ غمِ حیات سے گھبرا نہ اے جگر
ایسی بھی کوئی شام ہے جسکی سحر نہیں

(۲)

وہ جو روٹھیں یوں منانا چاہئے — زندگی سے روٹھ جانا چاہئے

ہمت قاتل بڑھانا چاہئے — زیرِ خنجر مسکرانا چاہئے

لذتیں ہیں دشمنِ اوجِ کمال — کلفتوں سے جی لگانا چاہئے

زندگی ہے نام جہد و جنگ کا — موت کیا ہے؟ بھول جانا چاہئے

(غیر مطبوعہ) — جگر مرادآبادی

حشرِ جذبات

اب کیا کروں شکایتِ حسنِ بہانہ جو سے — آگے نکل گیا ہوں دنیائے رنگ و بو سے

جب یاد آئی مجھ کو رنگینیٔ گلستاں — گلکاریاں قفس میں کیں اپنے ہی لہو سے

وہ پوچھتے ہیں مجھ سے کیا مدعا ہے میرا — اے کاش کچھ سمجھتے انداز گفتگو سے

تو مطمئن ہو شاید منزل کی سختیوں سے — ذوقِ طلب بڑھیگا اور تیری جستجو سے

اب صبر کی حدوں سے باہر ہے ضبطِ الفت — کبتک تسلّیاں دوں میں دل کو گفتگو سے

مجھ خوگرِ ستم کو کچھ تو تسلّیاں دے — مایوس ہو نہ جاؤں میں تیری آرزو سے

سمجھا ہے اسکا کچھ بھی تو نے مآل ثاقب

الجھا رہا ہے دل کو تو حسنِ رنگ و بو سے

ثاقب کانپوری

(غیر مطبوعہ)

چند لمحے ٹیگور کے ساتھ

عبد الحئی صاحب ایم - اے

اسے توارد کہئے یا محض اتفاق کہ آج سے چند سال قبل جب پنجاب میں "ترجمانِ حقیقت" علامہ اقبال کا انتقال پرملال ہوا - تو میرا قیام لاہور میں تھا اور جبکہ "سونر دیس" کے ہر دلعزیز شاعر ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کا سانحۂ ارتحال پیش آیا ہے تو میں کلکتہ میں مقیم ہوں - شاعر بنگالہ نے جمعرات کے روز دوپہر کو بارہ بج کر دس منٹ پر داعی اجل کو لبیک کہا - اس وقت میں کلکتہ یونیورسٹی میں تھا اور جبکہ شاعر اعظم کی وفات کی اندوہناک خبر ہنوز میرے کانوں تک نہیں پہنچی تھی - میں کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی کے صدر ڈاکٹر بھٹا اچاریہ پی، ایچ - ڈی سے "ادبیات میں مقامی اثرات" کے موضوع پر تبادلۂ خیالات کر رہا تھا - اثنائے گفتگو میں انگریزی کے ہندوستان میں مقیم شعراء بالخصوص کپلنگ کا ذکر بھی آیا - اس وقت میں بحر تخیلات میں مستغرق تھا کہ جہاں بنگالہ کی زرخیز زمین نے (جس کو بنگالی لوگ اپنی زبان میں "سونر دیس یعنی سونے کی زمین" بولتے ہیں) ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور جیسے نغمہ گو شاعر کو پیدا کیا ہے جس کے میٹھے گیت حسن تغزل کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں - وہاں "مردم خیز" خطۂ پنجاب نے "زندہ دل" شاعر علامہ اقبال کو پیدا کیا جس کا کلام، پیام زندگی اور زندہ دلی کا بہترین مظہر ہے ـــ بہر کیف مجھے کیا معلوم تھا کہ ٹیگور ابھی ابھی ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا ہے!

اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ آناً فاناً ٹیگور کی وفات کی خبر آگ کی سی سرعت کے ساتھ گردو نواح میں پھیل رہی ہے - یونیورسٹی کی ایم اے کی کلاسوں کا کام بند ہو گیا - دفتروں اور اداروں میں تعطیل ہو گئی جسے دیکھا ماتمی رنگ میں نظر آیا - بہت سے عقیدت مندوں کی آنکھوں میں سے آنسو رواں تھے - ادھر اُدھر، یہاں، وہاں - جہاں، تہاں "ٹیگور" اور صرف "ٹیگور" ہی کا چرچا تھا - بعض ذکر کر رہے تھے کہ آج صبح کے اخبار میں علالت کی نازک حالت کی خبر پڑھ کر ہی ان کو دھڑکا لاحق ہو گیا تھا - اور اب وہی ہوا جس کا ان کو کھٹکا تھا -

تھوڑی دیر بعد میں یونیورسٹی کے دفاتر سے باہر نکلا، تو جس کو دیکھا وہ ٹیگور کے گھر کی راہ لئے ہوئے

تھا۔ ٹرام۔ موٹریس۔ گاڑی۔ سواری۔ پیدل غرضیکہ جیسا بھی کسی سے بن پڑا، پھولوں کے ہار اور گل دستے ہاتھوں میں لئے رام رام کی سمرن کرتا ٹیگور کے آبائی مکان واقع "جوڑا سانکو" کی طرف جا رہا تھا۔ کالج اسٹریٹ میں میڈیکل کالج کے سیکڑوں طلبا پھولوں کے ہار لیے جاتے ہوئے دکھائی دیئے۔
اس دوران میں مقامی روزناموں نے ٹیلی گراف یا خاص ایڈیشن شائع کر دیئے تھے۔ جن میں شاعر اعظم کی گوشہ گیری کی خبر جلی عنوانات سے طبع کی تھی تاہم میں بھی کشاں کشاں اس ملک الشعراء کے درِ دولت یا "دار الفنا" کی طرف گیا جہاں پہلے ہی ایک جم غفیر موجود تھا۔ جم غفیر کیا تھا بلکہ لہریں مارتا ہوا آدمیوں کا ایک بے پناہ سمندر تھا۔ تمازت آفتاب سے سب لوگ بے حال ضرور ہو رہے تھے مگر شاید مقناطیس کو بھی لوہے سے کچھ کم ہی کشش ہوتی ہوگی جتنی کہ ان بے صبر و بے قرار عشاق کو ٹیگور سے معلوم ہو رہی تھی۔ ان کی والہانہ محبت و عقیدت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ دم گھٹ رہا تھا، کھوا سے کھوا چھلتا تھا۔ تل دھرنے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ اسی ہل چل اور ریل پیل میں پاؤں سے جوتے اور بدن سے کپڑے اتار اتار کر اس بحر زخار میں یوں گر رہے تھے کہ پھر ان کا پتہ بھی نہ چلتا تھا کہ وہ کہاں گئے لیکن پھر بھی ان ہزارہا لوگوں کی یہی دلی آرزو تھی کہ وہ بنگالہ کے اس لاثانی فرزند کے آخری "درشن" کر سکیں۔ چنانچہ بہت سے اشخاص اپنی آرزو میں کامیاب بھی ہوئے شاید شمع پر پروانے اتنی تعظیم و تکریم سے نثار نہیں ہوتے جس قدر میں نے متعدد لوگوں کو یہاں ٹوٹ کر گرتے دیکھا۔ اور اس کے ساتھ میں یہ بھی سوچ رہا تھا۔ کہ یہ عجیب بات ہے کہ یہ شمع بجھتے ہی اس قدر بے شمار پروانوں سے گھر گئی ہے۔
ٹیگور کی ارتھی لے جانے کا منظر بھی کلکتہ کیا بلکہ ہندوستان کی تاریخ میں یادگار رہیگا جوں جوں ارتھی شمشان بھومی کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ توں توں آدمیوں کا ہجوم بھی بڑھتا جاتا تھا۔ بڑے بوڑھوں کا یہ کہنا ہے کہ "دیش بندھو چترنجن داس کے بعد کلکتہ میں کبھی اتنے آدمیوں کا انبوہ و اژدہام دیکھنے میں نہیں آیا۔ اور کیوں نہ ہوتا جبکہ ٹیگور نے اپنے لاثانی اور غیر فانی نغموں سے سب لوگوں کے دل میں گھر کر لیا تھا۔
ٹیگور کی موت کوئی معمولی موت نہیں بلکہ بقول شخصے یہ ایک بہت بڑی موت ہے۔ ایک مثل مشہور ہے کہ "مرگِ عالم مرگِ عالَم" ٹیگور حقیقی معنوں میں ایک بہت بڑے

عالم تھے۔ پس ان کی موت گویا ایک پوری قوم یا کل دنیا کی موت ہے۔ ان کا ماتم کسی خاص حلقہ یا دائرہ تک محدود نہیں۔ بلکہ یہ ایک عالمگیر ماتم ہے۔ اس غم میں ہندو مسلمان بنگالی غیر بنگالی، ہندوستانی غیر ہندوستانی سب بلا امتیاز مذہب و ملت شامل ہیں۔ آنجہانی اس قدر بے شمار خوبیوں کے مالک تھے کہ ان سب کے بیان کرنے کے لئے دفتر چاہیئے۔ یہاں میں آپ کی متعدد خوبیوں کے صرف ایک پہلو کا تذکرہ کرتا ہوں۔ دیگر اصناف کا ذکر انشاء اللہ تعالیٰ پھر کروں گا۔

یہ میری انتہائی خوش قسمتی تھی کہ مجھے ٹیگور کی زندگی میں ان سے شرف ملاقات حاصل تھا۔ اور اس پر میں جس قدر بھی ناز کروں بجا اور کم ہے۔ آج سے چند سال قبل میں ایک مدت مدید اور عرصہ بعید کی دلی آرزو کو پورا کرنے کیلئے بعد شوق عقیدت اس "شاعر اعظم" کے آستانہ تک پہونچا۔ میرا شوق ملاقات سالہا سال سے میرے دل میں پرورش پا رہا تھا اور روز بروز فزوں سے فزوں تر ہوتا جاتا تھا۔ سب سے پہلے ٹیگور کا نام میں نے آج سے تقریباً بیس برس قبل بچپن کے عالم میں سنا تھا۔ اور وہ یوں کہ اسکول میں طالب علمی کے زمانہ میں میرے مطالعہ سے ٹیگور کے انگریزی افسانوں کی ایک کتاب گذری جس کا نام اسٹوریز فرام ٹیگور تھا۔ اس کتاب کے سرورق پر لانبی ڈارھی اور سر پر لانبے لانبے بالوں والے بظاہر ایک درویش صفت شخص کی تصویر تھی جس کو دیکھتے ہی مجھے خیال گذرا کہ شاید یہ کوئی خیالی مرقع ہے۔ جسے مصنف نے کتاب کے سرورق کو جاذب نظر بنانے کے لئے شائع کیا ہے۔ نیز یہ کہ شاید کتاب کے متن میں "درویش" سے متعلق کوئی قصہ دیا گیا ہے۔ لیکن جب میں نے اپنے معلم سے اس بارہ میں استفسار کیا تو انھوں نے مجھے سمجھایا کہ نہیں۔ یہ تو کتاب کے مصنف کی اپنی تصویر ہے۔ جس کا نام رابندرا ناتھ ہے۔ اور وہ بنگالہ کا رہنے والا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ باوجود ہندوستانی ہونے کے انگریزی علم و ادب پر بھی کامل عبور رکھتا ہے۔ اس مختصر سے تعارف کے بعد میں نے کتاب کا مطالعہ شروع کیا۔ پہلا ہی افسانہ "کابلی والا" پڑھ کر اس قدر متاثر ہوا کہ مجھے اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔ اس وقت تک میں نے جتنے قصے کہانیاں پڑھی تھیں ان میں سے کسی کا کوئی کردار بھی میرے دل کی عمیق ترین گہرائیوں میں جاگزین نہ

ہوا تھا۔ بہت سے قصّے فرضی بھوت پریت کے ہوتے تھے۔ بہت سی کہانیاں مہمل اور بے بنیاد معلوم ہوتی تھیں۔ مگر "کابلی والا" کا افسانہ پڑھ کر مجھے یہ ایک فرضی افسانہ نہیں بلکہ حقیقت حال اور سچا واقعہ معلوم ہونے لگا۔ میں اس وقت اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ افسانہ نویسی میں "فطرت نگاری" سے آشنا ہوا۔ مجھے وہ کہانی پڑھ کر یاد آرہا تھا کہ کس طرح ہمارے شہر میں بھی کابل کے قوی ہیکل پٹھان لابنے لابنے کرتے پہنے آیا کرتے تھے۔ اور کسی طرح "منی" کی طرح چھوٹے چھوٹے بچے ان کو دیکھ کر مبہوت و متعجب ہو جایا کرتے تھے۔ یہ کہانی پڑھتے وقت میں یہ بھی محسوس کر رہا تھا۔ گویا ٹیگور نے میرے ہی خیالات کی اصل ترجمانی کی ہے۔ واقعی ایک ادیب کا معراج کمال یہی ہوتا ہے کہ اس کے قلم سے جو الفاظ بھی نکلیں ہم یہ سمجھیں کہ گویا یہ بھی ہمارے دل سے نکلے ہوئے ہیں۔ دبیر الملک مرزا غالبؔ نے اسی نکتہ کو یوں ادا کیا ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا   میں نے یہ سمجھا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اس افسانہ کو پڑھ کر دوسری کہانی جسے پڑھ کر میں متاثر ہوا وہ "ایک تھا راجہ" کے عنوان سے تھی اس کہانی میں بھی وہی ادائے معصومیت وہی حقیقت نگاری اور وہی "لذت تقریر" کی چاشنی تھی جس کا ذکر میں پہلے افسانے کے ضمن میں کر چکا ہوں۔ اس کے بعد میں تیسری، چوتھی غرضیکہ سب کہانیاں جلد جلد پڑھ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سبھی ہماری خانگی زندگی کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ میں ان کہانیوں کو بار بار پڑھتا تھا۔ اور ہر مرتبہ ایک نیا لطف اور ایک نیا سبق حاصل کرتا تھا۔

اس کتاب کے مطالعہ کے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد مجھے ٹھیک یاد ہے کہ ایک روز میری نظر مصر کے ایک عربی اخبار پر پڑی۔ جس میں ٹیگور کی تصویر تھی اور عربی زبان میں کالم کے کالم "ٹیگور" کی تعریف و توصیف میں شائع ہوئے تھے۔ (عربی زبان میں ٹیگور "تیکور" "طاکور" لکھا جاتا ہے اور شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ڈاکٹر رابندر ناتھ کا اصلی نام "ٹیگور" نہیں بلکہ "ٹھاکر" ہے جس کی بگڑی ہوئی یا انگریزی میں تبدیل شدہ شکل "ٹیگور" ہے اور جیسا کہ عام طور پر شاید معلوم ہوگا "ٹھاکر" کے معنی سردار یا مالک کے ہیں۔ بہرکیف اس کے کچھ دن بعد میری نظر اسی شاعر کی مشہور و معروف کتاب "گیتان جلی" گزری۔ جس پر ٹیگور کو دنیا کا سب سے بڑا انعام موسوم بہ "نوبل پرائز" ملا تھا۔ یہ کتاب پڑھتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مجھے ایک کھوئی ہوئی نعمت مل گئی ہے۔ کتاب

میں بہت سی نظموں کے ساتھ ساتھ آرٹ کی نہایت انمول تصویریں بھی تھیں جو مصوری کا بہترین نمونہ ہونے کے علاوہ بعض اشعار کی اس قدر صحیح ترجمانی کرتی تھیں کہ میں ان کے خد و خال کو تنہائی میں بیٹھ کر پہروں دیکھتا رہتا۔ اور پھر بھی طبیعت سیر نہ ہوتی۔ چند اشعار کی تصویریں بہت بے مثال تھیں۔ مثلاً گیتا نجلی "ایک نظم کے پہلے شعر سے متعلقہ تصویر بعنوان یہ تیرا پایا انداز ہے" میں مصور نے دکھایا ہے کہ شاعر محبوب کو اپنا سر اس کے قدموں کے تلے رکھنے کے لئے پیش کر رہا ہے (انگریزی ترجمہ میں پا انداز کے لئے "فٹ اسٹول" استعمال ہوا ہے جس کا اردو ترجمہ "پا انداز" سے بہتر شاید اور کوئی نہیں مل سکتا) ان میں اکثر تصاویر ٹیگور کی اپنی تھیں اور باقی ان کے بھائیوں اور دیگر اعزا کی تھیں۔ کیونکہ یہ پورا خاندان ہی آرٹ اور ادب کا دلدادہ ہے۔

"گیتان جلی" کی ایک ایک نظم کو میں پڑھتا جاتا تھا اور مجھ پر وجدانی کیفیت طاری ہوتی جاتی تھی۔ پڑھتے پڑھتے میں بہت سی نظموں کا اردو ترجمہ کرتا گیا جن کو ادبی رسائل میں اشاعت کے لئے دے دیا۔ اور دل میں ارادہ کیا کہ میں پوری کتاب کا ترجمہ کروں۔ مگر ایک روز جبکہ میں یہ ترجمہ کر رہا تھا مجھے میرے ایک دوست نے بتایا کہ اس معرکۃ الارا کتاب کا اردو ترجمہ مولانا ابو المعانی نیاز فتحپوری صاحب بہت عرصہ ہوا کر چکے ہیں۔ اور وہ دہلی سے شایع بھی ہو چکا ہے۔ پس پھر میں نے اس کتاب کے ترجمہ کا کام چھوڑ دیا۔ اور ٹیگور کی دوسری تصانیف مثلاً "خوشہ چیناں" اور "باغبان" "اور نیا چاند" وغیرہ کا باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ چاروں طرف اردو کے تقریباً تمام ادبی رسائل میں ٹیگور کے تتبع میں "منظوم نثر" کے ٹکڑے اکثر شایع ہوا کرتے تھے اور اردو کے بعض شعرائے کرام اردو نظم میں بھی ٹیگور کے نغمات کا ترجمہ کیا کرتے تھے۔ مثلاً مجھے ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری مرحوم کا ایک اردو ترجمہ اب تک یاد ہے جو ذیل میں درج کرتا ہوں۔

موت دستک دیگی جس دم تیرے دروازہ پہ آ کیا تو اضع اپنے مہماں کے بجالائے گا تو

اس ضمن میں مجھے گیتاں جلی" کی ایک اور نظم کے ایک شعر کا منظوم ترجمہ یاد ہے ؎

جب تو دیتا حکم ہے مجھ کو کہ ہوں نغمہ سرا فخر سے دل میرا سینہ میں سما سکتا نہیں

اسی زمانہ میں دیکھتے ہی دیکھتے اردو ادب میں چند ایسے نوجوان انشا پردازوں اور شاعروں کا گروہ پیدا ہو گیا جس نے ٹیگور کے رنگ میں لکھنا ہی اپنا شعار بنا لیا تھا۔ اور بقول

شینیے" اس جدید طرز نگارش کی وجہ سے اُردو نثر میں غیر مادی فضا کا عنصر غالب ہوتا گیا۔ روحانیت کی آڑ میں عبارت کو آراستہ کرنے کے لئے خوشنما الفاظ سے ایسا بانکپن پیدا کرنے کی کوشش کی گئی جو معنوی اعتبار سے بالکل مہمل تھا" بایں ہمہ اس سے ٹیگور کی عالمگیر مقبولیت کا ثبوت ملتا تھا۔ اور میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ اُردو کے نئے دور کے شعراء مثلاً جوش، آفسر، جگر۔ اختر شیرانی اور امجد حیدرآبادی کے ابتدائی کلام میں ٹیگور کا اثر بہت نمایاں ہے۔ آفسر تو بالخصوص ٹیگور سے سب سے زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کا ایک شعر ہے جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان پر ٹیگور کے کلام کا کس قدر اثر ہوا ہے ؂

ایک دیوانِ حافظ دوسرا گیتان جلی ہوں یہ دو چیزیں تو پھر انسان دولتمند ہے

بہرکیف ایک مدت کے بعد بالآخر مجھے ایک روز ٹیگور سے ملاقات اور بالمشافہ گفتگو کا موقعہ ملا شام کا وقت تھا۔ شاعر اعظم اس وقت باہر ٹہلنے کے لئے جانے کے لئے تیار ہو رہے تھے کہ میں ان کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ میرے ہمراہ میری اہلیہ اور خوشدامن صاحبہ بھی تھیں جس کمرہ میں شاعر بنگال بیٹھے ہوئے تھے۔ اُس سے باہر ٹیگور کے پرائیوٹ سکریٹری نے ہمارا استقبال کیا اور سماً پوچھا "کیا آپ لوگ گورو دیو کے "درشن" کے لئے آئے ہیں؟" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ اور کہا کہ میرے ساتھ پردہ نشین خواتین ہیں اس لئے ہم شاعر مشرق سے علحدگی میں ملاقات کریں گے۔ اس پر وہ بنگالی بابو کمرے کے اندر جا کر سب لوگوں کو ہٹ جانے کے لئے ہدایت کر آیا اور ہمیں نہایت ادب سے آ کر اطلاع دی کہ اب آپ لوگ اندر جائیے۔ ہم کمرے میں داخل ہوئے یہ کمرہ کیا تھا ایک بہت بڑا ہال تھا اور وہاں ایک بہت بڑے کوچ پر ایک دیو قامت شخص بیٹھا ہوا تھا۔ چہرے پر بلا مبالغہ پیغمبرانہ جلال تھا۔ برف جیسی سفید نورانی لمبی ڈاڑھی۔ سر پر بڑے بڑے درویشانہ بال۔ ایک لمبا سفید سادہ چغہ زیب تن تھا۔ پاؤں تک جسم ڈھکا ہوا تھا۔ صرف ہاتھوں کی موٹی موٹی انگلیاں دکھائی دے رہی تھیں اس کے علاوہ اس کا گول کتابی چہرہ، موٹی اور بھاری ستواں ناک بڑی بڑی رسیلی آنکھیں جن کے گرد ہلکے ہلکے سیاہ دائرے اس بات کا ثبوت تھے کہ شاعر ابھی ابھی گہرے غور و فکر میں محو تھا۔ عمر کی زیادتی کے سبب کہیں کہیں جھریاں بھی نمایاں تھیں۔ مگر اتنی زیادہ نہیں جتنی کہ عام طور پر بوڑھے آدمیوں کے چہرے پر دکھائی

دیتی ہیں۔ ضعف غالب تھا۔ مگر پھر بھی ہمت کی مضبوطی اور ارادہ کی قوت صاف عیاں تھی۔ ہمارے اندازے کے خلاف جسم کی رنگت بہت صاف اور سفید تھی، ورنہ ہمارا خیال تھا۔ کہ باقی بنگالیوں کی طرح اُن کی رنگت بھی سیاہی مائل ہوگی، قد و قامت سے بھی وہ بنگالی نہیں بلکہ سرحدی معلوم ہوتے تھے
اِس صوفی منش بزرگ کو دیکھتے ہی ہماری گردنیں فرطِ احترام سے بےساختہ جھک گئیں شاعر نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں سامنے کی کرسیوں پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ اور پھر ہاتھ کے اشارہ ہی سے ہماری مزاج پُرسی کی، جس سے میں نے یہ اندازہ کیا کہ شاعر کم سخن اور کم گو ہے۔ بہرحال مستورات کو میں نے سامنے کی کرسی پر بٹھایا۔ اور خود شاعر کے بائیں پہلو میں قریب جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور حرفِ مطلب زبان پر لانا چاہا، لیکن معاً خیال پیدا ہوا کہ بات چیت اُردو میں کروں یا انگریزی میں؟ میری یہ عادت ہے کہ میں انگریزوں تک سے گفتگو اُردو میں شروع کرتا ہوں اور جب دیکھتا ہوں، کہ اُردو میں اظہارِ خیال نہیں کر سکتے، تب مجبوراً انگریزی کی طرف رجوع کرتا ہوں، پس اُس وقت میں نے مادرِ وطن، ہندوستان کے ایک بہت بڑے آدمی کے ساتھ انگریزی زبان میں بات چیت کرنا مناسب نہ خیال کرتے ہوئے چاہا۔ کہ اُردو یا ہندوستانی میں گفتگو کروں۔ لیکن میں اِس درویش صفت شاعر کے انداز سے اس قدر متاثر ہو چکا تھا۔ کہ میں نے یک لخت اُردو زبان میں سلسلہ کلام شروع کرنا بے ادبی سمجھا۔ مجھے اپنی زندگی میں متعدد اور مختلف مدارج اور حیثیتوں کے لوگوں سے ملنے اور بات چیت کرنے کا موقع ملا ہے۔ مگر میں سچ کہتا ہوں کہ میں آج تک کسی شخصیت سے بھی مرعوب نہیں ہو سکا تھا۔ لیکن اُس وقت اس صوفی منش بزرگ کا اثر میرے دل و دماغ پر اس قدر ہوا، کہ میں بیان نہیں کر سکتا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ابھی تک شاعر کے منہ سے کوئی کلمہ تک نہیں نکلا تھا، جس کو سنکر گمان غالب تھا۔ کہ ہم اور زیادہ مرعوب ہو جائیں گے۔ ہماری زبانیں گویا بند ہو گئیں اور صرف ہماری آنکھیں قفسِ دید تھیں۔ ہم بار بار شاعر کو سر سے پاؤں تک دیکھتے جا رہے تھے۔ اور آنکھوں کے ذریعہ ہی ہم یہ محسوس کر رہے تھے کہ آج زندگی میں پہلی مرتبہ ایک حقیقی شاعر کو اپنے اصل رنگ میں جلوہ فرما پایا۔ تاہم چند پل تک اِس سکوت کے بعد میں نے چاہا۔ کہ اب قفلِ خاموشی کو توڑوں۔ پس میں نے بزبان انگریزی ہی یوں گفتگو شروع کی۔ "اُمید ہے کہ آپ اُردو زبان جانتے ہوں گے؟"
ٹیگور نے جو شاید بحرِ تخیلات میں مستغرق تھے اور شاید چند لمحوں کے لئے ہماری موجودگی سے

بھی بے خبر ہو رہے تھے، اپنی بڑی بڑی آنکھیں میری طرف پھیریں میں سہم سا گیا۔ مگر میں نے نہایت غور سے دیکھا کہ یہ عتاب کی آنکھیں نہیں تھیں، بلکہ ان میں ایک خاص ترحم اور ترنم تھا۔ جو آج تک بھی میرے کانوں میں بدستور گونج رہا ہے۔ آپنے بزبان انگریزی ہی جواباً ارشاد فرمایا: "نہیں مجھے بہت افسوس ہے کہ میں اُردو جیسی پیاری زبان نہیں جانتا، اگرچہ یہ میری دلی خواہش رہی ہے کہ میں یہ زبان سیکھتا۔"

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور جیسی رفیع المرتبت ہستی کے منہ سے یہ الفاظ سنکر میرے دل میں اُردو کی بے قدری کا دھندلا سا عکس آگیا۔ اور میں نے فوراً یوں عرض کیا "لیکن میں سمجھتا ہوں، آپ تھوڑی بہت اُردو ضرور جانتے ہوں گے، کیونکہ اس وقت میرے ساتھ مستورات ہیں، جو انگریزی سے پورے طور پر واقف نہیں ہیں اور وہ آپ کی زبان سے بغیر ترجمان سے آپکے کچھ ایسے ارشادات سننا چاہتی ہیں، جو وہ بخوبی سمجھ سکیں"

اس پر شاعر اعظم یوں گویا ہوئے، "ہاں۔ میں تھوڑی بہت اُردو سمجھ ضرور لیتا ہوں، لیکن صحیح اُردو بولنا میرے بس کی بات نہیں۔ بہرحال اگر وہ چاہیں، تو ایک مترجم کے ذریعہ وہ مجھ سے ہمکلام ہو سکتی ہیں۔ اور آپ اُن کی ترجمانی کرتے جایئے۔"

میں نے جواب دیا "بہت بہتر" اور پھر مستورات کی جانب متوجہ ہو کر اُردو میں کہا کہ شاعر اعظم فرماتے ہیں، کہ وہ اردو میں بات چیت نہیں کر سکتے۔ اس لئے آپ اُن سے میری وساطت سے ہمکلام ہو سکتی ہیں۔

اس پر میری اہلیہ کہنے لگیں، کہ ہم شاعر کے منہ سے تبرکاً چند اشعار اُن کی اُس زبان میں جس نے اپنی غیر فانی نظمیں کہی ہیں سننا چاہتے ہیں اور بس، چنانچہ میں نے یہ فرمائش شاعر اعظم کو انگریزی میں ترجمہ کر کے بتائی یہ سنکر ٹیگور کے لبوں پر ایک ہلکا سا تبسم کھیلنے لگا۔ اور آپنے مسکراتے ہوئے بزبان انگریزی ہی ارشاد فرمایا "مگر آپ بنگالی نظم کا مطلب کیونکر سمجھیں گی؟" میں نے اس کو اُردو میں ترجمانی کر کے بتایا، جواب ملا۔ کہ خواہ ہم مطلب سمجھیں یا نہیں، مگر قدرتی طور پر ایک شاعر کے منہ سے اسی زبان میں اُس کا کلام سننے میں لطف آتا ہے، جس میں اسکے دماغ میں خیالات کی آمد ہوتی تھی، میں نے یہ "جواب درجواب" انگریزی میں ترجمہ کر کے شاعر کو بتایا، اس پر وہ مزید مسکرائے، اور کہا، اچھا۔ یہ بات ہے، تو لیجئے، میں بنگلہ زبان میں ایک چھوٹی سی نظم سُنا دیتا ہوں۔ اس کے بعد وہ ایک دو لمحے تک شاید یہ سوچتے رہے کہ کون سی نظم سناؤں اور پھر بنگلہ زبان میں ایک نظم سنانا شروع کی۔ اشعار سناتے وقت شاعر نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، کبھی کبھی وہ یہ

ہاتھ کی انگشت شہادت سے معمولی سا اشارہ کیا یا اپنے دائیں پاؤں کے نیچے کو چند بار فرش پر اٹھایا اور کہا، جس سے شاعر کی فن موسیقی مہارت کا ثبوت ملتا تھا۔ شاعر کی زبان سے اشعار کی روانگی یوں معلوم ہو رہی تھی جیسے چشمہ اُبل رہا ہو۔ اور زمین اور دیواریں اور چھت اور تمام چیزیں رقص کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ ہم سب دم بخود بیٹھے تھے اور کوشش کر رہے تھے کہ شاعر کے سراپائے انداز سے اُس کے اشعار کا مطلب اخذ کر سکیں۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ نظم کوئی معرفت الٰہی کا نغمہ تھی جس کو شاعر نے ہمارے سامنے الاپا تھا۔ اس وقت کا ماحول اور فضا اور بالخصوص شاعر کا انداز بیان نظم کے نفس مضمون کو اظہر من الشمس کر رہا تھا۔ ممکن ہے کہ شاید میں غلطی پر ہوں۔ کیونکہ یہ واقعہ آج سے کئی برس قبل کا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ہستی بھی دنیا سے اُٹھ گئی ہے جو اس امر کی تصدیق کر سکتی۔

نظم ختم ہو جانے پر چند لمحوں کے لئے کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ اور پھر میں نے اپنی طرف سے نیز مستورات کی طرف سے شاعر کا اس عنایت کے لئے شکریہ ادا کیا، اور پھر ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے شاعر کو بتایا۔ کہ یہ میرے ہمراہ میری اہلیہ اور خواہران ہیں۔ ان کے ایرانی وضع کے سیاہ برقعے اور نقاب دیکھکر شاعر کو شبہ ہوا تھا کہ شاید یہ ایرانی خواتین ہیں۔ چنانچہ آپ نے اس امر کا اظہار بھی ان الفاظ میں کیا کہ کیا یہ ایرانی نژاد ہیں، میں نے نفی میں جواب دیا اور عرض کیا کہ نہیں ہم سو فیصدی ہندوستانی ہیں۔ مجھے معاً یاد آیا۔ کہ شاعر اعظم کو ایران میں اعلیٰ حضرت رضا شاہ پہلوی نے مدعو کیا تھا۔ اور وہاں اُن کی وہ آؤ بھگت ہوئی تھی جو شاید ہی کسی اور ملک میں ہوئی ہو۔ پس لازمی طور پر وہ مملکت ایران کے اس جوش استقبال سے بیحد متاثر ہوئے ہوں گے۔ اور لامحالہ آج بھی ان کے دل میں ایران میں قیام کی یاد چٹکیاں لے رہی ہوگی۔

بہرحال چونکہ نماز کا وقت قریب آ رہا تھا۔ اس لئے ہم بادل ناخواستہ شاعر سے اجازت کے ملتجی ہوئے۔ ہمارے مذہبی فریضہ کی ادائیگی کے ارادہ کے اظہار سے ٹیگور بہت خوش ہوئے اور کہا کہ افسوس! دنیا میں بہت سے لوگ اپنے مالک حقیقی کو بھولتے جاتے ہیں۔ حالانکہ ہم کو چاہئے کہ ہم صبح و شام اپنے پیدا کرنے والے کو یاد رکھیں۔

یہ ہیں میرے وہ چند لمحے جو ٹیگور کے ساتھ مختصر سی ملاقات اور گفتگو کے دوران میں گزرے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ میری زندگی کے بہترین لمحے ہیں۔

ندامت

علی جواد زیدی

وہ دن بھی جوانی ہی کی گرمی میں پڑے تھے
جب آگ کے دریاؤں میں کھیتا تھا سفینہ
پیمانہ و ساغر کا کبھی دل نہیں توڑا
چھوڑی نہیں اک روز بھی صہبائے شبینہ
تخئیل کے تپتے ہوئے پہلو میں رہا کی
رنگینیٔ افکار کی گلفام حسینہ
یوں میرے تصور میں رہی یاد کسی کی
جیسے کسی انمول انگوٹھی پہ نگینہ
دنیا میں کسی شے کی کبھی فکر نہیں کی
کیا چیز تھا وہ سال، وہ ہفتہ، وہ مہینہ
اب جیل کی دنیا میں جو کرتا ہوں کبھی یاد
ماتھے سے ٹپکتا ہے ندامت کا پسینہ

(بنارس سینٹرل جیل میں لکھی گئی)

خواب و خیال

رابندرناتھ ٹیگور

مترجمہ

سیّد علی رضا رضوی

درگا پوجا کی تعطیل تھی میں اپنے ایک رشتہ دار کے ہمراہ ملک کے مختلف مقامات کی سیر کرنیکے بعد کلکتہ واپس جا رہا تھا حسن اتفاق سے میں جس درجہ میں بیٹھا اُس میں ایک اور صاحب بھی تشریف فرما تھے - وضع قطع سے تو دلی کے سیدھے سادے مسلمان ہونے کا شک ہوا لیکن کچھ دیر گفتگو سننے کے بعد ایسا معلوم ہوا کہ ہفت اقلیم کی سیر کر چکے ہیں وہ دنیا کے ایک ایک گوشہ کی مدد سے اس طرح بنا کر پیش کرتے تھے گویا قدرت ہر ایک معاملے میں اُن سے مشورہ کر لینے کے بعد کسی انتظامی پروگرام کو عملی جامہ پہناتی ہے -

دنیا میں کیسے کیسے حیرت انگیز واقعات رونما ہو رہے ہیں - روس کے باشندے بہ نسبت دیگر اقوام کے تہذیب معاشرت اور سیاست میں کتنا آگے بڑھ گئے ہیں - انگریز مدبر یں کیسے کیسے منصوبوں اور ارادوں کو مدنظر رکھتے ہوئے قدم آگے بڑھا رہے ہیں ہندوستانی سرمایہ دار کس طرح اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علحدہ بنانا چاہتے ہیں - غرض وہ اس قسم کی ایک طویل داستان چھیڑے ہوئے تھے - لیکن ان تمام باتوں سے میری عدم واقفیت ہی ایک وجہ تھی کہ میں آنکھ بند کئے پڑا تھا - صاحب موصوف نے شاید مجھے اونگھتے ہوئے دیکھ کر مسکرا کر کہا : - انگریزی میں کہا -

اخباروں میں شائع شدہ خبروں سے آسمان و زمین کی فضاؤں میں کہیں زیادہ اور کہیں اہم واقعات ہوا کرتے ہیں

وطن سے باہر قدم نکالنے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا - اس سے پہلے ایسی جسارت کبھی نہ کی تھی اور نہ کبھی ایسے لفاظوں سے سابقہ پڑا تھا اسلئے ان کی باتیں سنکر سخت تعجب ہونے لگا - ایک ایک جملے پر وہ ثبوت کے طور پر مختلف زبانوں کے اشعار اور مقالات پیش کر رہے تھے ان کی اس ہمہ دانی کو دیکھ کر میرے حساس دل پر بھی ان کی قابلیت اور علمیت کا سکہ بیٹھتا ہی گیا حتیٰ کہ ہمارے تھیوسفسٹ عزیز کو جو

میرے ہمسفر تھے ان کی ذات بابرکات پر ایک مافوق الفطرت انسان ہونے کا یقین ہوگیا ۔ انھوں نے سمجھا کہ وہ یقیناً کسی نامعلوم قوت کے حامل ہیں ۔

مسمریزم ۔ میگنیزم ۔ یا کوئی اور ایسی ہی قوت ۔ ممکن ہے دیو ۔ جن یا پری قبضہ میں ہو ۔ بہرصورت ایک نہ ایک محیر العقول کارنامے کے واحد مالک ضرور ہیں بس انھیں خیالات کی بنا پر ہمارے عزیزدوست نے جیب سے نوٹ بک نکالی اور جاسوسوں کی طرح ہمسفر لکچرار کے قابل قدر جملوں کو ڈائری میں اس طرح درج کرنے لگے جیسے وہ اپنے سوانح حیات قلمبند فرما رہے ہوں ۔

ان کی اس حماقت کو وہ صاحب بہادر بھی تاڑ گئے ۔ میں نے دیکھا کہ اب وہ اپنی گفتگو کو اور زیادہ قابلیت اور علمیت کا جامہ پہنانے لگے ۔ انھوں نے ان کی شکست فاش اور اپنی بعید از توقع کامرانی دیکھکر اپنی پر معلومات گفتگو کو اور بھی فلسفیانہ کر دیا ۔ گاڑی جب جنکشن پر رکی تو مجھے دوسری گاڑی کے لئے مسافرخانہ میں قیام کرنا پڑا لیکن تھوڑی دیر میں خبر ملی کہ راہ میں لائن خراب ہو جانے سے گاڑی دیر میں آئیگی میں نے سوچا لاؤ ایک نیند اور سہی ابھی بستر بچھا کر بیٹھ سید علی بھی نہ کی تھی کہ میرے فلسفی ہمسفر نے ایک طویل لیکن دلچسپ داستان شروع کر دی ۔ فرمانے لگے ۔

" ریاست جونا گڈھ کے کچھ اصول سے اختلاف کی بنا پر میں مستعفی ہو کر حیدرآباد چلا گیا ریاست حیدرآباد نے مجھے تندرست و توانا دیکھکر روئی کے محصول وصول کرنے کیلئے بھڑوچ کی روئی بازار بھیجدیا ۔ بھڑوچ بہت پر لطف مقام ہے دریائے ستا کوہستانی حصہ سے کسی نازک خرام معشوق کی طرح اٹھکھیلیاں کرتا ہوا بے پناہ جنگل کی تاریکی میں آگے جاکر غائب ہوگیا ہے لب ساحل دریا سے تقریباً دو سو زینوں کی بلندی پر ایک محل ہے جو اس خوبصورت منظر کا لطف لینے کیلئے صدیوں سے یونہی ایک صورت میں برقرار ہے ۔ آس پاس کوئی بستی نہیں ایک روئی بازار ہے وہ بھی یہاں سے کافی دوری پر ۔ تقریباً ڈھائی سو برس قبل محمود شاہ ثانی نے اسے اپنی تفریحگاہ کیلئے مخصوص کیا تھا یہ محل اوسی کا بنایا ہوا ہے یہاں آکر بادشاہ مہینوں قیام کرتا تھا ۔ اسی محل کے غسل خانے کے فوارے سے گلاب کی بارش ہوتی تھی جسکی پھواریں ایرانی ماہ وش اپنی آغوش میں ستار رلیکر زلفیں بکھرائے شیریں نغمے چھیڑا کرتی تھیں ۔

اب نہ وہ فوارے ملتے ہیں اور نہ وہ نغمے گائے جاتے ہیں ۔ نہ اس شفاف اور سفید سطح زمین پر

حسینوں کی خوشخرامیاں ہی نظر آتی ہیں اب اسے مجھ جیسے بدصورت کلکٹروں کی قیامگاہ سمجھئے۔
جب میں یہاں آیا اسی دن میرے دفتر کے ہیڈ کلرک کریم خاں نے مجھسے تاکید کی کہ اس محل میں ہرگز نہ ٹھہرئیگا جی چاہے تو دن بھر خوب گھوم پھر لیجئے لیکن شب کو یہاں سونا خطرے سے خالی نہیں۔ میں نے اسکی بات ہنسی میں اڑا دی نوکروں نے بھی کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا میں نے اپنے دل میں سوچا ارے توبہ یہ محل کس قدر بدنام ہوگیا ہے کہ رات کو چور تک اسمیں حصہ بخرے کیلئے جمع ہونیکی ہمت نہیں کرتے۔ مرحوم بادشاہ کی روح جسکے شوق کی یہ یادگار ابھی تک قائم ہے ان لوگوں کی ان بے بنیاد باتوں سے کس قدر رنجیدہ ہوتی ہوگی۔
میں نے کسی کی ایک نہ سنی اور وہیں جاکر رہنے لگا لیکن میں نے محسوس کیا کہ پہلے ہی دن وہ واہمہ جسے اپنی اپنی زبان میں ہر ایک شخص ایک نئے لفظ سے یاد کرتا تھا مجھ پر سوار ہوگیا ایسا معلوم ہوا کہ میں کسی نامعلوم بارسے دبا جارہا ہوں۔ لیکن وہ بوجھ دکھائی نہیں دیتا۔ میرا معمول تھا کہ دن بھر خوب جان توڑ محنت کرتا اور شام کو تھکا ماندہ آکر پلنگ پر جاتے ہی خراٹے لینے لگتا۔
لیکن ابھی ایک ہفتہ بھی نہ گذرا تھا کہ اس مرمریں محل کی اس نامعلوم ہستی نے کچھ اور ہاتھ پاؤں پھیلایا اور مجھپر قبضہ کرنا شروع کیا۔ گذشتہ واقعات کا دہرانا بہت مشکل ہے اور سمجھانا اس سے کہیں زیادہ دشوار محل کے ہر در و دیوار مجھے اپنے میں جذب کرنا چاہتے تھے انہیں وجوہ سے میں روز بروز لاغر ہونے لگا۔
اب میں یقیناً کہہ سکتا ہوں کہ پہلے ہی دن میرے محل میں قدم رکھتے ہی اُس نے اپنا کام شروع کردیا تھا لیکن جس دن میں نے کریم خاں کے انتباہ کا احساس کیا اس دن کے واقعات مجھے شروع سے آخر تک یاد ہیں۔
گرمی کا زمانہ۔ بازار بالکل خراب۔ مجھے فرصت ہی فرصت تھی۔ غروب آفتاب سے کچھ قبل میں وسیع زینہ پر کرسی ڈالے اطمینان سے بیٹھا ہوا شام کے منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ دریا گرمی کی وجہ سے بالکل نہیں تو کسی حد تک ضرور خشک ہو گیا تھا دریا کی دوسری جانب ریگستانی حصہ افق کی سُرخی سے رنگین نظر آرہا تھا۔ پانی میں جا بجا پتھر کی چٹانیں آفتاب کی آخری کرن کے پڑنے سے چمک رہی تھیں۔ ہوا بالکل رکی ہوئی تھی۔ قریب کے جنگل سے تلشی۔ پودنہ۔ اور

سونف کی خوشبو کی لپٹ دماغ کو تازگی بخش رہی تھی۔ جب آفتاب غروب ہو گیا۔ شام ہوئی لیلائے شب نے اپنے سیاہ بال کھولے ہر طرف تاریکی چھاگئی میں نے سوچا چلوں کچھ دور کی سیر کر آؤں پھر آ کے سو رہوں گا لیکن ابھی اٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ کسی کے پاؤں کی آہٹ محسوس ہوئی۔ مڑ کر دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ کانوں کو دھوکا ہوا ہو گا میں یہ سمجھ کر جوں ہی پھر سیدھا ہو بیٹھا کہ ایک ساتھ کئی پاؤں کی آوازیں سنائی دیں اس طرح جیسے کئی سہیلیاں ملکر دوڑتی چہل کرتی سیڑھیوں سے اُتر رہی ہوں۔ میں خوف سے کانپنے لگا۔

اگرچہ میری نگاہوں سے دوران تمام منظر نوازیوں کا کرشمہ جاری تھا پھر بھی میں اس خوف سے کہ دریا میں غیر معمولی قوتوں کا اجتماع ہے روحوں کا جمِ غفیر پانی کی لہروں سے کھیل رہا ہے اپنی جگہ لرز اٹھا۔ اس میں شک نہیں کہ میں ساری باتیں سن رہا تھا آپس کی چھیڑ چھاڑ دیکھ رہا تھا یہ بھی علم تھا کہ سب واہمے قیاسی اور توہم آمیز خیالات کی نقش ادائیاں ہیں لیکن جی یہی چاہتا تھا کہ یہ منظر ہمیشہ قائم رہے اور میں دیکھتا جاؤں۔ یکایک مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ان نازپرور حسینوں میں سے دو چار آپس میں ایک دوسرے کو دوڑاتی ہوئی میرے پاس سے گذر گئیں۔ لیکن واہ رے بے التفاتی کہ ایک نظر بھی مڑ کر میری جانب نہ دیکھا۔

دریا طوفان خیز صورت میں بدل گیا۔ لیکن اسی بے پناہ شورش میں وہ سب نہاتی رہیں اور ایک دوسرے پر پانی پھینکتی رہیں۔ پیرنے والیوں کی کوشش سے پانی کے بلبلے موتیوں کی طرح بکھرنے لگے۔ میں کہہ نہیں سکتا کیوں؟ خوف۔ دلچسپی۔ مسرت یا کسی ایسی ہی وجہ سے میرا جسم کانپ اٹھا شوق نے ابھارا وقت غنیمت ہے لطف اندوز ہو لو ورنہ پھر یہ مسرت خیز منظر نصیب بھی نہ ہوگا۔ لیکن اُمید بھری نگاہ سے جب دیکھنے کی کوشش کی تاریکی کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ معلوم ہوا کہ کان لگا کر دیکھنے سے ساری باتیں صاف سنائی دینگی لیکن کتنا ہی غور کیا وہی جنگلی جھینگروں کی آوازیں کانوں میں پہنچی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میری نظروں پر کسی نے پردہ ڈال دیا ہے اگر وہ پردہ اٹھا دیا جائے تو صدیوں پہلے کے واقعات پیش نظر ہوں۔ لیکن وائے قسمت ہزار کوشش پر بھی سوائے اس اندھیری فضا کے جو لیلائے شب کی مرہون منت تھی کچھ نہ دکھائی دیا۔

مجھے نظر آیا کہ ہوا کی رفتار تیز ہو گئی۔ دریا کا پانی تلاطم کی صورت میں بدل گیا۔ لہریں بڑھیں

اور چاہتی تھیں کہ مجھے کھینچ لے جائیں کہ میں ہوش میں آگیا۔ ممکن ہے ان واقعات کو کوئی شخص قیاس آرائیاں اور بے بنیاد تخئیل سمجھے لیکن میں اسے قدر کی نگاہوں سے اب بھی دیکھتا ہوں کیونکہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اپنے کانوں سے سنا۔۔۔۔ وہ صدیوں پہلے کی ایک رنگین تصویر ۔۔۔۔۔۔ قابل عزت ہے۔

ہاں ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ خوشرو۔ خوش اندام عورتیں۔ جو میرے سامنے خوش فعلیاں کرتی ہوئی آئیں جست کر کے دریا کی آغوش میں کوٹیں لینے لگیں۔ اور کچھ دیر نہانے کے بعد اپنی بھیگی ہوئی زلفوں کو نچوڑتی ہوئی پانی سے نکلکر میرے پاس سے ہوتی ہوئی گذر گئیں سوکھے ہوئے پھولوں کی لپٹ کی طرح کس طرف اور کہاں غائب ہوگئیں ؟

ایک دفعہ تو یہ خیال ضرور گذرا کہ یہ تمام مناظر شاعروں کی فرضی کردہ تصویروں کیطرح ہیں جو قلم کے رکتے ہی نقش برآب کیطرح مٹ جاتے ہیں ممکن ہے کچھ ایسا ہی خیال مجھے بھی فریب دے رہا ہو۔ اور مجھے اس روئی کی کلکٹری کی تکلیفوں۔ اذیتوں اور صعوبتوں سے آزاد کرانے آیا ہو۔ اسے میرا خاتمہ کرانا مقصود ہے میں نے معاً اس نتیجہ تک پہنچتے ہی سوچا لو آخری وقت آگیا آج خوب پیٹ بھر کے روغن دار چٹ پٹا کھانا کھالوں ورنہ جنت میں ملے یا نہ ملے۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا اگر خلوئے معدہ سے بخارات دماغ تک پہنچ رہے ہیں اور مجھے یہ ہری ہری سوجھ رہی ہے تو ایک لقمہ کے پہنچتے ہی سب دور ہو جائیگا۔

میں نے اپنے ملازم کو بلا کر آج خوب لذیذ اور مرغن کھانا تیار کرنیکا حکم دیا اور تھوڑی دیر میں کھا پی کر سو رہا۔ دوسرے دن صبح مجھے یہ گذشتہ واقعات افسانہ معلوم ہوئے میں نے صبح کھانے سے فارغ ہو کر نیکٹ پہنا اور ہیٹ سر پر رکھتے ہوئے صاحب بہادروں کیطرح آفس کیطرف رخ کیا کوچوان فٹن لئے منتظر تھا میرے بیٹھتے ہی گھوڑوں کو باگ ڈور کے اشارہ سے ہوا کر دیا۔

اس دن مجھے سہ ماہی رپورٹ لکھنی تھی اسلئے واپسی میں کچھ دیر لگتی لیکن ابھی شام ہو چلی تھی کہ کوئی نامعلوم ہستی مجھے محل کی طرف کھینچنے لگی کون کھینچ رہا تھا یہ نہ دیکھا نہ سنا صرف دل میں اس بات کی خلش پیدا ہو رہی تھی کہ سارے کام چھوڑ کر چلدو۔ اب دیر کرنا مناسب نہیں اتنا بھی خیال نہ کیا کہ ابھی آفس میں سب بیٹھے ہوئے ہیں نہ جانے کیا سمجھیں آخر انہیں اس مفارقت

میں کونسی بھاگڑ پڑی ہے بغیر کچھ سوچے سمجھے رپورٹ نامکمل چھوڑ کر روانہ ہوگیا۔
زینہ کے اوپر والا دیوانخانہ کافی سے کہیں زیادہ وسیع تھا اتنا وسیع کہ معمار کو عمارت کی خوبصورتی برقرار رکھنے کیلئے تین حصوں میں چھت کو منقسم کرنا پڑا۔ محراب پیدا کر دینے سے اب وہ مجبوری ایک صنعت معلوم ہوتیگی۔
برسہابرس خالی رہنے کیوجہ سے کمرہ کی ہر دیوار و ہر حصہ تیں برس رہی تھیں۔ اتفاق دیکھئے اُس دن شام بھی ہوگئی لیکن ملازم نے چراغ نہ جلایا تھا میں جیسے ہی کمرہ کا دروازہ کھولکر اندر داخل ہوا میں نے دیکھا کہ اُس تاریک کمرہ میں ایک بھاگڑ سی پڑگئی۔ وہاں کی تحیر خیز ہستیاں ایک ایک کرکے کھڑکی۔ دروازہ جدھر سے راہ ملی بھاگ گئیں۔ چشم زدن میں پہلی سی خاموشی چھاگئی۔
اون کے جانے کے بعد میں نے دیکھا کہ وہاں ایک کرسی بھی نہیں تھی سارا جسم ایک خاص وقفہ کیلئے لرز اٹھا۔ میں وہاں کھڑا ہوا گویا روحوں کی بھنبھناہٹ اور مردوں کی سی بو محسوس کر رہا تھا۔ پھر بھر کی آواز کے ساتھ فوارے کا پانی سنگ مرمر کے سفید فرش پر گرا۔ ستاروں کی سریلی آواز گونجی پازیب کی چھم چھم جھانجھ کی جھنکار نوبت کی راگنیاں۔ باہر کے برآمدے سے بلبل کی سریلی آواز۔ صحن باغ سے سارسوں کی پکار غرض ان دلفریبیوں نے میرے چہار طرف ایسا نظارہ پیدا کردیا تھا جسے میں خلد بریں بر۔وے زمین سے کسی طرح کم نہیں سمجھتا۔
اس دیدہ زیب تخیل فریب تصور سے عالم بیخودی میں میں دنیا کی ہر ایک چیز کو ہیچ و پوچ سمجھنے لگا محکمہ جنگی میں روئی کے محصول کی جانچ کرنے کیلئے میں یہاں کلکٹر بنا کے بھیجا گیا ہوں روزانہ ہیٹ کوٹ پہنکر اپنے ہاتھوں سے فٹن ہنکاتا ہوا دفتر جایا کرتا ہوں ایک مذاق اور بے سر پیر کی باتیں معلوم ہونے لگیں یکایک یہاں کھڑے کھڑے میں کھل کھلا کر زور سے ہنس دیا۔
اتنے ہی میں میرا مسلمان چپراسی ہاتھ میں جلتا ہوا لمپ لیکر کمرہ میں داخل ہوا اوس نے مجھے تنہا اندھیرے کمرہ میں ہنستے ہوئے دیکھکر پاگل سمجھا یا نہیں یہ میں نہیں کہہ سکتا لیکن اُسے دیکھکر مجھے اتنا ضرور یقین ہوا کہ اب میں جنت کی سیر کرتے کرتے پھر واپس آگیا ہوں۔ پھر یہ خیال ہوا کہ ممکن ہے دنیا ہی کے کسی حصہ میں گلاب پاش فوارہ چلتا ہو۔ نازک انگلیوں کی چھیڑ سے جو ساعت قریب نغمے میں سن چکا تھا ممکن ہے کسی جگہ اس زمین پر ہو رہا ہو۔ اسکے بارہ میں ہمارے شعرائے

کرام زیادہ بہتر بتا سکتے ہیں کہ آیا میرا یہ خیال صحیح تھا یا غلط لیکن اتنا ضرور سچ ہے کہ میں بٹرونچ کے بازار میں چنگی وصول کرنیوالوں کا افسر اعلیٰ ہوں یہ سوچتے سوچتے میں نے ٹیبل پر سے اخبار اٹھایا اور روشنی کے پاس بیٹھکر پڑھنا شروع کر دیا۔

اخبار پڑھنے کے بعد کھانا کھایا اور کھانے کے بعد ہی روشنی گل کر کے بستر پر لیٹ رہا۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے آسمان پر تاروں کی انجمن کا ہر ایک ممبر مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ میں کب تک سوتا رہا یہ نہیں کہہ سکتا لیکن کسی کے نازک اور نرم ہاتھوں سے جگانے کے باعث میں اٹھکر بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ بالکل خاموش ہے لیکن ان انگلیوں سے جن میں انواع واقسام کے جواہرات کی انگشتریاں پہنی ہوئی تھیں اپنے ساتھ آنیکا اشارہ کر رہی تھے اگرچہ وہاں میرے سوا تھا کون لیکن نہ جانے کیوں ہر ایک قدم پر خوف بھی طاری تھا کہ مبادا کسی کی آنکھ نہ کھل جائے اور راز افشا نہ ہو۔

شب کی تاریکی میں جہاں ہاتھ کو ہاتھ نہیں دکھائی دیتا تھا میں برآمدے زینے۔ کمرے طے کرتا ہوا اوس کے ساتھ چلا جا رہا تھا یکایک وہ ایک پردہ کے سامنے جا کر ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی اور اور ایک طرف اشارہ کر کے مجھے کچھ دکھانے لگی دیکھتے ہی میرے سارے جسم کا خون جم کر برف ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک حبشی محل کا لباس پہنے ننگی تلوار لئے پاؤں پھیلائے سو رہا ہے اتنے ہی میں وہ قتالہ عالم حبشی کے پھیلے ہوئے بھدے اور سیاہ پاؤں کو بچاتی ہوئی پردے کے پاس گئی اور اوس کا ایک سرا اٹھایا اندر کا تھوڑا سا حصہ نظر آیا۔

فارس کا بنا ہوا غالیچہ بچھا تھا۔ تخت پر کوئی بیٹھا ہے یہ دکھائی نہ دیا صرف زعفرانی رنگ کا پائجامہ اسکے نیچے زری کی جوتیاں پہنے چھوٹے چھوٹے دو خوبصورت پاؤں گلابی مخمل کے فرش پر نہایت لاپروائی سے پھیلے دکھائی دئیے۔ فرش پر ایک خوش نما چینی کے قاب میں سیب ناشپاتیاں۔ سنگترے۔ انگور کے سبزی مائل خوشے اس طرح سجے ہوئے کہ منتظم کے سلیقہ کی داد دینے کو دل بیقرار ہو جائے۔ عین اسی کے نزدیک بلوری ساغر اور اور سرخ رنگ کی تو بہ شکن شراب کا ایک جام بھی رکھا ہوا تھا۔ اندر سے ایک قسم کا خوشبودار دھواں باہر فضا کو مہکانے میں معاون بن گیا۔

میں جوں ہی اوس غلام کے پھیلے ہوئے پاؤں کو بچا کر اندر کی جانب بڑھا تھا کہ وہ جاگ اٹھا اُسکی آغوش میں پڑی ہوئی برہنہ ایرانی تلوار فرش پر گر پڑی تلوار کے گرنے سے کھٹاکے کی آواز کیسا تھ معاً میری آنکھ کھل گئی - میں نے دیکھا کہ اپنے بستر پر میں پسینہ میں تربتر پڑا ہوا ہوں - دور سے پاگل کی آوازیں آرہی ہیں - "دور رہو، دور رہو - سب جھوٹا ہے سب جھوٹا ہے"

تمام دن میں شب کے ان واقعات کے بھلا دینے کی کوشش میں لگا رہا رپورٹ لکھنے کے علاوہ پرانے کاغذات نکال نکال کر ایک علحدہ دفتر تیار کیا، دن بھر سخت محنت کرنے کے بعد بھی جب دوسری شام آئی تو اوس رات کے قصے کی یاد پھر تازہ ہوگئی - میں نے نہ جانے کس ترنگ میں کوٹ اور پتلون کے بجائے بوٹے دار انگرکھا - مخملی ٹوپی - پھولدار قبا - ریشمی جبا پہنکر معطر رومال ہاتھ میں لیا اور سامنے پیچوان رکھکر یوں گڑگڑانا شروع کیا جیسے دو صدی پہلے کی کسی بڑی سلطنت کا شاہزادہ ہوں - کہ پھر طوفان آیا اور چلم معہ حقے کے اُلٹ گئی - چلم کے ٹونٹو کی آواز سے جاگ پڑا دیکھا تو نہ چلم تھی نہ خمیرہ کا خوشبو دار دھواں نہ تو کریبنے سے آگ کی چنگاریاں ہی ادھر ادھر پڑی ملیں - غرض روزانہ ایسے ہی نت نئے اقسام کے خواب نظر آنے - ادھر آنکھ لگی اور پہنچے دوسری دنیا میں جہاں سوائے حسینوں کے چھیڑ چھاڑ - سرمایہ داری کے بے نظیر منظر کے سوا کچھ ہوتا ہی نہ تھا غریبوں کا نام و نشان بھی وہاں نہ ملے -

وہ پردہ والی دلفریب صورت تو گویا میرے مٹانے اور برباد کرنے پر تلی ہوئی تھی ایک روز ہلکی سی جھلک دیکھنے کا جرم ایسا ناقابل معافی جرم تھا جکی پاداش میں وہ وہ ہر وقت میرے دماغ میں رہنے لگی ادھر کاموں سے فرصت ملی اور اس کا خیال آیا وہ جھک جھک کر آتی اور اوسی پردے میں غائب ہو جاتی مجھے ہر وقت اوسی کا خیال رہنے لگا آنکھ لگی اور میں بھٹکا گلی گلی کوچہ کوچہ میں مارا مارا پھرنے لگا -

ایک رات کا واقعہ ہے کہ جب میں تمام آئینہ کے سامنے اسکے ہر دو جانب شمعیں روشن کر کے ایک شہزادے کا روپ بدل رہا تھا میں نے دیکھا کہ یکایک میرے داہنے بائیں

دو ایرانی طویل القامت شاہزادے آکھڑے ہوئے ایک نے بڑھ کر جلتی ہوئی بتیاں گل کر دیں اندھیرے سے مجبور ہو کر میں پھر اپنے بستر پر جا لیٹا.......

ایک روز شام کے قریب تفریح کو جانے کا ارادہ تھا لیکن ابھی تیار بھی نہ ہوا تھا کہ کوئی شخص مجھے روکنے لگا میں نے اوس کی ایک نہ سنی اور کھونٹی سے لباس اتار کر جیسے ہی پہننا شروع کیا ویسے ہی دریا کے اُس پار سے ایک ایسا تیز اور تند طوفان آیا کہ میرے ہاتھوں سے کپڑے تک چھین لے گیا اس دن بھی میں ٹہلنے کیلئے نہ جا سکا۔ اسی وقت سے میں نے بیسٹ کوٹ پہننے کا ارادہ ہی ترک کر دیا۔

کھانا کھا کر طوفان کی شرارت اور کچھ اپنی تفریح کی ناجائز قربانی کے خیال میں بستر پر لیٹا ہوا سوچ رہا تھا کہ نیند آ گئی لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد میں میری پلنگ کے نیچے کسی کے رونے کی آواز سنائی دی...... میں فوراً اٹھکر بیٹھ گیا۔ رونے والا نہایت پر درد لہجہ میں کہہ رہا تھا۔ میری قدر کرو اس مصیبت میں میرا ساتھ دو خواب وخیال کے طلسم کو توڑ کر جنگل۔ پہاڑ یا دریا طے کر کے مجھے اپنی دنیا میں لیچلو.......

میری قدر کرو...... میں کون ہوں؟.......

کس نے جواب یا نظریں گواہی نہیں دیتیں وہ کون تھا؟ ممکن ہے میرے ضمیر نے یہ کہا ہو:۔ میں تمہاری عزت کروں اس رنج وغم میں تمہارا ساتھ دوں۔ کیوں۔ کس لئے؟ تم کیا تھیں۔ کب تھیں کس خوش نصیب ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئیں کون سنگدل رہزن تم سی نازک کلی کو آغوش مادرست توڑ کر کسی دور ودراز ملک کی بازار میں بیچنے کو لے گیا۔ وہاں کس بادشاہ کا کون خوشامد خور ملازم تمہاری دلفریب صورت کو دیکھکر سونے کے سکون کے عیوض خرید کر سمندر پار اپنی حرص وحوث کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانے لے گیا وہ کون تاریخ تھی کیسا عبرت آموز دن تھا۔ دلکش نغمے۔ گھنگروکی آوازیں چھلکتے ہوئے شیرازی جام آتش سیال کے گھونٹ حلقوں میں اتار رہے تھے۔ سرنگیں گھٹائیں ساغروں کے لڑھنکی آوازیں۔ اف کیا تو یہ شکن منظر وحسن وجمال کی بمثال یادگاریں ہیرے کی چوڑیاں پہنے بزم کی بزم کو متوالا بنا رہی تھیں۔

شہنشاہ ملکۂ محفل کے قدموں پر پر زر جوتیوں کے پاس زمین پر لوٹ رہے تھے۔ بیرونی

دروازے پر اسی حبشی کی شکل و شباہت والا ایک شخص برہنہ تلوار سنبھالے پہرہ دے رہا تھا۔ ان عیش و مسرت کی لہروں سے کھیلنے کے بعد یکایک تم قعرِ ذلت و خواری میں پھینک دی گئیں۔ وائے قسمت تم کیا تھیں۔ کہاں تھیں اور اب کہاں ہو؟"

اتنے ہی میں اُس پاگل مہر علی کی بھیانک آواز سنائی دی" دور رہو دور رہو۔ سب جھوٹا ہے سب جھوٹا ہے" صبح ہو گئی تھی آنکھ کھلتے ہی دیکھا سامنے چپراسی ڈاک لئے کھڑا ہے نہ جانے وہ کیوں مسکرا دیا برا تو ضرور معلوم ہوا لیکن چپ رہ گیا کچھ کہا نہیں۔ کاغذات پر جلد دستخط کرکے اُسکے حوالہ کیا اور تاکید کی کہ آئندہ علی الصباح نہ آیا کرو۔ بڑے بابو سے کہدینا کہ گھر آرام کے لئے ہے کام کرنے کے لئے نہیں کام کرنے کے لئے دفتر مناسب جگہ ہے وہ مودبانہ سلام کرکے چلا گیا۔

اُس دن میں وقت سے کچھ پہلے ہی دفتر پہنچا لیکن کیا کام کیا؟ ..... کچھ نہیں..... لطف یہ کہ جوں جوں شام قریب آنے لگی۔ مجھے محکمہ کا محکمہ ہی فضول اور ناقص معلوم ہونے لگا نظام کی نظامت ہی لغو سمجھ میں آئی۔ چلنا پھرنا کھانا پینا سب بیکار اور بے لطف تمام رجسٹر شاید دو منٹ میں بند کئے اور فٹن ہانکتا ہوا جلد یا فٹن خود بخود محل تک پہنچا گئی نہ میں نے گھوڑوں کو اشارے دیئے نہ باگ موڑی جلد جلد سیڑھیاں طے کرتا ہوا میں اندر پہنچا ہر دیوار پر حسرت برستی نظر آئی ذرہ ذرہ مخالف معلوم ہوا کلیجہ منہ کو آنے لگا کس سے کہوں کہ میری خطائیں معاف کردو اب بھلانیکی کوشش تاعمر نہ کروں گا۔

آسمان پر بادلوں کے جھنڈ منڈلا رہے تھے سیاہ اور تاریک ابر دامنوں میں بے پناہ بارش کا سرمایہ لئے شاید کسی نے چھیڑ دیا ہوگا چشم زدن میں موسلا دھار پانی برسنے لگا کھڑکیاں بجنے لگیں دروازے سر ٹکرانے لگے نوکر چاکر سب دفتر والے مکان میں تھے تاریکی اور حد درجہ تاریکی کوئی روشنی کرنے والا بھی نہ تھا اس اندھیاری میں نظر آیا.....

ایک عورت حسن کی دیوی۔ میرے پلنگ کے پاس غالیچہ پر بیٹھی ہوئی اپنی پتلی پتلی انگلیوں سے سر کا بال نوچ نوچ کر پھینک رہی ہے نوچے ہوئے بالوں سے خون کی دھاریں جاری ہیں کبھی ہنستی ہے اور کبھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے لیکن بالوں کے ساتھ دشمنی کا برتاؤ جاری ہے۔ کھلی ہوئی کھڑکیوں سے پانی کی بوچھار اوسکے نرم اور گداز جسم کو نہلا رہی تھی۔ تمام رات نہ بارش

رکی نہ آندھی تھمی یں محل کے ایک ایک کمرہ میں اِدھر اُدھر بھٹکتا پھر الیکن اُس کے غائب ہوئے ہی وہ سمجھے نہ مل سکی۔ کس کو سمجھاتا اور کس کے زخم دل پر مرہم بنتا ؛ پاگل دیوانے کی آواز نے پھر چونکا دیا دیکھا تو صبح ہو چکی تھی اور " دور رہو دور رہو سب جھوٹا ہے" کی آوازیں چلی آرہی ہیں۔ پاگل مہر علی چلاتا چلا جا رہا ہے معاً مجھے خیال گذرا کہیں اس محل کی وجہ سے تو مہر علی کی یہ حالت نہیں ہو گئی نہیں وہ بھی تو یہاں آکر نہیں ٹھہرا تھا۔ ہو سکتے ہی میں اندھی پانی میں دوڑتا ہوا مہر علی کے پاس پہنچا اور بے ساختہ پوچھ بیٹھا کیا جھوٹا ہے ہے" یہ بھی نہ سمجھا کہ آخر پاگل تو پاگل دیوانہ تو دیوانہ کیا خاک جواب دیگا ۔۔۔ وہی ہوا مہر علی نے جواب تو دیا نہیں لیکن پاگلوں سے گفتگو کرنا یا کچھ پوچھ گچھ کرنے کا صلہ ضرور دید یا اوسنے مجھے ایک دھکا دیکر زمین پر گرا دیا اور دور رہو دور رہو کی آوازیں دیتا ہوا محل کے چار طرف چکر کاٹنے لگا۔

چوٹ لگی اور اچھی طرح لگی پانی کیوجہ سے ناگہہ سنبھلنا چاہا لیکن نہ سنبھل سکا منہ کے بل گرا پیشانی ۔ کہنی زخمی ہوئی چھوٹے چھوٹے پتھر کے ٹکڑے جو روزانہ پاؤں کے نیچے رہتے تھے جانی دشمن نکلے بہر نوع اچھا خاصا خون آلود ہو کر اور کریم خاں کو بلا کر سب سے پہلے اوس سے یہی پوچھا مہر علی کیا کہتا ہے اور اس کا مطلب کیا ہے صاف صاف بتاؤ۔

ضعیف العمر کریم خاں نے بہت آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔

کوئی زمانہ تھا جب اس عمارت میں بود و باش تھی اب بھی اُسی کا اثر باقی ہے جو شخص اس محل میں تین شب سو رہے وہ زندہ یا صحیح سلامت باہر نہیں آ سکتا ایک مہر علی کو دیکھئے اگر مرا نہیں تو دماغ ضرور بگڑ گیا بیچارہ اِدھر اُدھر ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے ہر وقت یہی رٹ ہے دور رہو دور رہو سب جھوٹا ہے سب جھوٹا ہے۔

"میری مفر کی بھی کوئی صورت ہے" میں نے پوچھا

"صرف ایک" اوس نے کہا " اور بہت مشکل آپ کو بتائے دیتا ہوں لیکن حقیقت حال سے آگاہ کرنے کے پہلے ایک زر خرید ایرانی خادمہ کی داستان سنانا بہت ضروری ہے ایسا دردناک اور دل ہلا دینے والا قصہ کہ الامان الحفیظ۔

غلط فہمی

مسٹر شبھو چندر نگم ہیڈ ماسٹر ڈی اے وی ہائی اسکول اعظم گڈھ کی ایک ہندی کہانی کا یہ "آزاد ترجمہ" ہے۔ ترجمہ کا کام ہمیشہ دشوار رہا ہے۔ چنانچہ میں بھی انھیں مشکلات سے دوچار ہوا ہوں، پھر بھی مجھے امید ہے کہ ترجمہ بہت حد تک "کامیاب" سمجھا جائے گا۔

"کہانی" ایک نفسیاتی غلط فہمی کی سیر حاصل تشریح ہے، شروع سے آخر تک ایک دلچسپ حیرت کیساتھ آپ اسے پڑھیں گے۔ جگہ جگہ زندہ دلی کے نمونے بھی ملیں گے۔ کچھ اصلاحی باتیں بھی سامنے آئیں گی۔ مگر سب اسی ایک مرکزی "نقطہ نظر" کے ماتحت جسے مصنف ذہن نشین کرانا چاہتا ہے۔

شمس الدین حیدر شمیم کرہانی

جاڑوں کی رات تھی، ٹھنڈک کا زور تھا۔ لوگ بستروں پر جا چکے تھے۔ گاؤں میں سناٹے کا راج پھیل چکا تھا کہ سگا کہیں سے رونے کی آواز آئی، آواز سے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی دور کے جھونپڑے میں "بین" کر رہا ہے۔ ٹھاکر صاحب اپنے گرم بستر پر خاموش پڑے تھے، مگر ان کا دل اس دردبھری آواز کی طرف متوجہ تھا۔

تھوڑی دیر میں تین عورتیں ان کے مکان کے سامنے بات چیت کرتی دکھائی دیں۔

ایک نے کہا۔ کیسن سیدہ منئی رہل! (کیسا سیدھا آدمی تھا؟)

دوسری بولی۔ نراگئو، سیدہ منئی کو بھگوانو پوچھت ہیں، کبھوں مائی، بہنی، بھیا، چاچا چھوڑ بات نا کرے (بالکل گائے، سیدھے آدمی کو بھگوان بھی پوچھتے ہیں، کبھی مائی، بہنی، بھیا، چاچا کہے بغیر بات نہ کرتا تھا)

تیسری نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ کا ؤکہل جائے، دیوتا رہل دیوتا، سکھ دیا ابھاگن ہے، دھکا راندہو سے گئل۔ ابہیں بچوا گودی میں ہے نا؟ (کیا کہا جائے، دیوتا تھا دیوتا، سکھ دیا ابھاگن ہے، اُسے رانڈ ہونا لکھا تھا۔ بچہ ابھی گود میں ہے نا؟)

باتوں کا سلسلہ یہیں تک پہنچا تھا کہ ٹھاکر صاحب "دریافت حال" کے لئے بے چین ہو گئے۔ نوکر کو

دی۔ "کلوا! ارے او کلوا! ادھر آ"

کلو بولا "جی سرکار! اگر سردی لگتی ہو تو "برسی" جلا دوں" ٹھاکر صاحب نے گرم ہوکر کہا "اب سنتا ہے کہ اپنی ہی کھچڑی پکائے گا؟ جا ان عورتوں کو یہاں بلا" کلو سوچ میں پڑ گیا، ٹھاکر صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟ یہ تو ایسے مزاج کے نہیں تھے۔ "پھر آواز آئی "ابے جلدی جا" کلوا اب گھبرا گیا، رکتے رکتے بولا "سرکار! وہ تو اس گاؤں کی چمارن ہیں۔ بڑی نیچ جات ہیں۔ ٹھاکر صاحب چھتری تھے۔ اور وہ بھی سورج بنسی، مانا کہ جوانی میں ان کے چال چلن پر تھوڑے بہت دھبے پڑ گئے تھے۔ مگر کیا اس سے ذات اور "بنس" تھوڑے ہی بدل جاتا ہے۔ یہ تو جنم کی وراثت ہے، جو سدا رہتی ہے۔ کوئی زمین کی وراثت تھوڑے ہی ہے جو "ٹیننسی بل" پاس کرکے کانگریس گورنمنٹ ہڑپ کر لے۔ اس کے علاوہ ٹھاکر صاحب ادھیڑ بھی ہو چلے تھے۔ پھر اس وقت کلو کا ان کے چال چلن پر شک کرنا، برداشت کے باہر بات ضرور تھی۔ ٹھاکر صاحب نے پاس کی پڑی ہوئی کھڑاؤں تان کر ایسی چلائی کہ کلو کے سر سے خون بہنے لگا۔

کلو اس گھر میں بہت دنوں سے نوکر تھا۔ وہ بڑا سیدھا، ایماندار اور خاندان کا خیرخواہ تھا، ٹھکرائن اُسے بہت مانتی تھیں، ٹھاکر صاحب بھی اس کی خدمتوں کے قائل تھے، یہ پہلا موقع تھا جب انھوں نے اُسے مارا تھا، گالیوں کا ذکر نہیں، وہ تو زمیں داروں کے لیے "رام نام" ہے، کلو کو اس کی شکایت تھی نہ ٹھاکر صاحب نے اسے کبھی اپنی کمزوری سمجھا تھا۔

ٹھاکر صاحب اُٹھے، دوشالہ اوڑھا، اور کمرے سے باہر آئے، ادھر کلو روتا ہوا ٹھکرائن کے پاس پہنچا، ٹھاکر صاحب باہر نکل کے ادھر اُدھر تکنے لگے، مگر وہ عورتیں اس وقت نکل جا چکی تھیں، کس سے پوچھیں؟ رونے کی آواز اب بھی آرہی تھی، ان عورتوں کی بات چیت اور ماتم کے اس کہرام سے وہ اچھی طرح اندازہ لگا سکتے تھے کہ کس کی موت ہوگئی ہے؟ مگر انھیں یقین نہ ہوتا تھا، وہ سوچنے لگے "ابھی تو کل میرا بدن ملنے آیا تھا، نہیں نہیں ایشور نہ کرے کہ ایسا ہو، اس نے بڑی سیوا کی ہے، میری جان بچائی۔ ... اُن کے سامنے وہ سماں ناچنے لگا، جب لگان وصول کرتے وقت سیتا رام اور اس کی "استری" کو انھوں نے بیدردی سے مارا تھا، گاؤں کے لوگوں نے لاٹھی لے کر انھیں گھیر لیا تھا، رمئی نے سر ہتھیلی پر رکھ کے ان کی جان بچائی تھی جی میں آیا کہ اس کے جھونپڑے پر چل کے باتوں کا پتہ لگائیں، مگر خیال آیا "گاؤں کے ٹھاکر ہوکر ایک نائی کے دروازے پر جائیں؟ یہ شان کے خلاف ہے، جس پر حکومت کریں اس کی ماتم پرسی اس کے دروازے پر؟ یہ نہ ہوگا، کچھ دیر یونہی کھڑے سوچتے رہے کہ ایک لڑکا سامنے والی گلی سے آتا ہوا نظر پڑا۔ ٹھاکر صاحب کو دیکھ

اس نے سہم کر سلام کیا۔ ٹھاکر صاحب نے جواب دیئے بغیر سوال کیا "ابے کہاں سے آرہا ہے؟ لڑکے نے غمگین لہجے میں کہا، سرکار! رمئی ناؤ مر گیا۔ ٹھاکر صاحب بے چین ہو گئے، بار بار جی چاہا کہ اُسے دیکھنے جائیں مگر نہ جا سکے اور بالآخر "شان کے بھوت" ہی کی جیت ہوئی اور وہ سپر انداختہ کمرے میں واپس ہوئے۔ بستر پر لیٹ رہے، مگر منہ پر اداسی تھی۔

ٹھاکر صاحب اسی غم اور فکر کے ساگر میں غوطے لگا رہے تھے کہ ٹھکرائن آدھمکیں، کوئی آگ لگا دی تھی، بھلا آسانی سے کیسے بجھتی؟ چہرہ تمتایا ہوا نتھنے پھڑکتے ہوئے آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی، غصہ در نج کی گھٹا تھی کہ اُمنڈ چکی تھی، برسنے کی دیر تھی، ٹھاکر صاحب بیچارے تو افسوس میں پڑے تھے، رمئی کی موت ان کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہی تھی، دیکھتے ہی چونک کے بولے "کیا تمہیں بھی خبر ہو گئی؟ یہ سُننا تھا کہ ٹھکرائن کے دل میں آگ لگ گئی، بھری بندوق کا گھوڑا دب گیا، ٹھکرائن تمتما کے بولیں "کیا یہ خبر بھی چھپنے کی ہے؟ لیکن آن ارتھ "کی آشا مجھے کبھی نہ تھی"

ٹھاکر صاحب۔ "مجھے بھی آشا نہ تھی، بھگوان کی اِچھا"

ٹھکرائن۔ "بھگوان کی اِچھا" شرم نہیں آتی؟ میں کہتی ہوں کہ تمہیں اپنے دھرم اور عزت کا بھی دھیان ہے؟"

ٹھاکر صاحب۔ عزت کا دھیان نہ ہوتا تو میں چلا نہ جاتا؟ اسی وجہ سے تو میں وہاں گیا نہیں، تمہاری رائے ہو تو میں ابھی چلا جاؤں؟ میرا دل بھی بے چین ہو رہا ہے۔"

ٹھکرائن سے اب صبر نہ ہو سکا، اس کے دل پر ایسی پیہم چوٹیں پہنچیں کہ وہ بلبلا اُٹھی، آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے، وہ منہ سے کچھ نہ بولیں اور اندر چلی گئیں۔ ٹھاکر صاحب نے آنکھیں بند کرتے ہوئے دل میں کہا "رمئی کی موت نے انھیں بھی دکھ پہنچایا ہے، سچ مچ بیچارہ رمئی ایسا تھا ہی، اس کا احسان میرے سارے خاندان پر ہے، پھر ٹھکرائن کا کٹھور دل اگر اتنا کومل بن گیا ہے تو اس میں حیرت ہی کیا؟ وہ یہی سوچتے سوچتے تھوڑی دیر میں غافل سو گئے۔

رمئی کی موت کو تین دن ہو گئے، مگر ٹھکرائن نے ٹھاکر صاحب سے ایک بات بھی نہ کی، ٹھاکر صاحب گھبرا گئے، ان کا دل بیتاب ہو گیا۔ ان سے نہ رہا گیا، بول اٹھے "اب زیادہ دکھ نہ کرو، جو ہوا سو ہوا، بیتی ہوئی "گھٹنا" پر افسوس کرنے سے فائدہ؟" ٹھکرائن تا دیر چپ رہیں پھر آنسو بھری آنکھوں سے ٹھاکر صاحب کی طرف دیکھ کے بولیں "میں تھوڑے دنوں کیلئے میکے جانا چاہتی ہوں، میرا جی یہاں نہیں لگتا۔" ٹھاکر صاحب نے سوچا "ٹھیک ہے، اس وقت انھیں میکے بھیج دینا چاہئے، رمئی کی اچانک موت سے رنجیدہ ہیں،

ہاں پہنچ کے بہل جائیگی" سو نچ کے بولے "اچھا تمہارا دل اس طرح بہل جائے تو بڑی اچھی بات ہے۔"

(۳)

رمئی نائی بڑا ہنس مکھ اور ہر دل عزیز تھا۔ اس نے جھونپڑے کا دروازہ گاؤں کے زندہ دلوں کی "بیٹھک" تھا، بڑی رات تک لوگ اکٹھا رہتے تھے، چلم پر چلم چڑھتی تھی، رمئی کی ہنسی بھری باتوں اور یاروں کے قہقہوں سے اس کا گھر گونجتا رہتا تھا، مگر اب "دن چھپتے" ہی وحشت برستی، اندھیرے گھر میں سکھ دئی اور اس کے شیر خوار بچے کے سوا کوئی نہ ہوتا، سکھ دئی دکھ سے نڈھال ہوگئی، اس کی سمجھ میں یہ نہ آتا تھا کہ وہ اپنی اور اپنے جان سے پیارے بیٹے کی زندگی کیونکر گزارے؟

صبح کا وقت تھا، سکھ دئی کو دو فاقے ہو چکے تھے، اب اس سے نہ رہا گیا سوچی خودکشی کر لے۔ مگر بچے کا کیا ہوگا؟ اس کی دیکھ بھال کون کریگا؟ یہ خیال آتے ہی اسکی آنکھوں میں دنیا سیاہ ہوگئی، اس نے محسوس کیا جیسے دکھوں کے اتھاہ ساگر میں آہستہ آہستہ ڈوب رہی ہے، سنا کان میں آواز آئی "پنڈت جی کے بٹوا کا بیاہ ہے سسرال سے بڑا روپیہ ملا ہے" دو عورتیں اس کے جھونپڑے کے پاس سے بات چیت کرتی ہوئی گزر گئیں، سکھ دئی جیسے چونک پڑی، اُسے یاد آگیا کہ سالک رام کے لڑکے کا بیاہ ہونیوالا ہے، آج ہی تو اس بجے دن میں برات جائیگی" مگر ساتھ ہی اُسے حیرت بھی ہوئی کہ پنڈت سالک رام کا گھر تو اسی کی ججمانی میں ہے۔ پھر اسے کیوں نہیں بلایا گیا؟ پنڈت جی کے بڑے لڑکے لچھمی نرائن کی برات میں رمئی گیا تھا۔ سکھ دئی ہی نے نائن کے سارے کام انجام دئے تھے اور اُسی کو سب حق بھی ملے تھے، سکھ دئی نے سوچا "پنڈتائن کاموں کے جھنجھٹ میں بھول گئیں ہوں گی" جھٹ پٹ بچے کو گود میں سنبھالا اور ان کے گھر کی طرف چلدی، گھر میں قدم رکھتے ہی اُسے پھولا نائن دالان لیپتی ہوئی دکھائی دی، اس نے تیوریاں بدل کر کہا "تو کا کے بُلائس ہے؟ ای تو شگن کا کام ہوے، تو کے تنکو بچارنا ہے؟ سکھ دئی نے دھیمی آواز سے کہا "ہاں بہنی! ای تو ہم ہوں جانت ہیں کہ ای شگن کا کام ہے۔ تُماہرے آونے سے کیسے اشگن ہو جائی؟" یہ کہتی ہوئی وہ دھڑ دھڑاتی اندر چلی گئی۔

سکھ دئی۔ پاؤں لاگن ملکن! اب کی سرکار! دوسر ناؤن رکھ لیہن، ای تو ہمار ججمانی رہل، کون کسور پر سرکار ہم کا نا پوچھن؟ پنڈتائن نے جو سکھ دئی کو دیکھا تو پہلے لال پیلے دیدے نکالے، پھر بھویں چڑھا کے بولیں "دیکھ ملہ ریا شگن کے کام میں تیرا آنا ٹھیک نہیں، شادی بیاہ میں رانڈ بیوہ کا منہ نہیں دیکھا جاتا، تجھ کو کیا آج ہی آنا تھا، ڈائن کہیں کی، رمیا کو کھا گیا اور چلی ہے اس شگن کے کام کو اشگن کرنے، ہٹ دور ہو چڑیل"، سکھ دئی حیران رہ گئی، اس کے چہرہ کا رنگ اڑ گیا، اس کا دل دھک دھک کرنے لگا، سینے سے ایک دھواں اٹھا،

جو آنکھوں تک پہنچ کے آنسوؤں کی گھٹا میں تبدیل ہونے والا ہی تھا کہ اس نے جلدی سے بچے کو اٹھایا اور یہ کہتی ہوئی الٹے پاؤں واپس ہوئی "ماف کر دمائی، ای بات کا تنکو ہم کا دھیان نہیں آوا"
سکھ دئی جب اپنے جھونپڑے میں پہنچی تو بیتاب تھی "ڈائن ارسیا کو کھا لیا" پنڈتائن کا یہ جملہ اس کے دماغ میں چکر لگا رہا تھا وہ سوچنے لگی "کیا سچ مچ اس کے پتی کی موت اس کے سبب ہوئی ہے؟ یہ خیال آتے ہی وہ پاگل ہو گئی، اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا، بے اختیار آنسو جاری ہو گئے، بچہ جو بھوک سے بلک رہا تھا، ماں کو روتا دیکھ کر چیخیں مار کر رونے لگا، کہرام مچا تھا کہ باہر سے کسی نے پکارا "سکھ دیا لے سکھ دیا! مر گئی کیا؟ سکھ دئی آنسو پوچھتی ہوئی باہر نکل آئی۔ "بنسی" ٹھاکر صاحب کا کارندہ ہاتھ میں لمبی لاٹھی لئے کھڑا تھا، سکھ دئی سہم کے بولی "کا ہے بنسی بھیا؟"
بنسی۔ ہاں ہاں! ای کیسا منہ بنائے ہے، مر گی آوت ہے کا؟ جا ٹھاکر صاحب۔ تو کے بلائن ہیں"
سکھ دئی۔ میں ابھاگن ہوں بھیا! کون منہ لیکے جاؤں؟ کا جانے ٹھاکر صاحب۔ جانت ہیں کہ ناہیں کہ میں رانڈ ہو گیل ہوں، کہیں اُن ہوں کو برا لاگے؟
بنسی۔ کا بک بک کرت ہئی؟ جا سن لے،
سکھ دئی۔ "بھیا! ٹھاکر صاحب اس سمے گُستے تو نہیں ہیں"؟
بنسی۔ "ارے گُستا ہو نہیں تو کا تو کے کھا لی ہیں، تنچ جات کا جلدی مجاج ناہیں ملت"
بنسی یہ کہتا۔ پاؤں پٹکتا آگے بڑھ گیا، اسے خبر بھی نہ ہوئی کہ اس کے جملوں نے کسی کے زخم پر نمک چھڑک دیا، وہ اس کے دل کی پاکیزگی اور نرمی کو کیسے جانتا وہ گوالہ تھا، وہ بھگوان کرشن کی نسل سے تھا۔ جنھوں نے دریودھن ایسے ہیر کا گھمنڈ توڑا تھا، پھر بنسی کے سامنے سکھ دیا کی کیا حیثیت تھی، وہ کیوں نہ اکڑتا کون جانے کہ اس نے "کرشن اور سُداما" کی داستان ہمدردی" سُنی تھی، کسے خبر کہ گیتا کی یہ نصیحت کہ "انسان اپنے کرم اور برتاؤ سے اونچ نیچ بنتا ہے" اس کے کانوں تک پہنچی تھی، . . . . . . سکھ دئی لے روتے ہوئے بچے کو اٹھایا اور اس کے آنسو پوچھتی ہوئی چلی۔
ٹھاکر صاحب۔ کون! سکھ دئی؟
سکھ دئی ــ ہاں سرکار۔
ٹھاکر صاحب۔ ہم کو تمہاری حالت پر بڑا افسوس ہے، مگر تم فکر نہ کرو، ہم تمہاری مدد کریں گے"
سکھ دئی کے جان میں جان آئی، اس نے لگان لیتے وقت ٹھاکر صاحب کا برتاؤ دیکھا تھا اسے بڑی حیرت

ہوئی، یہ پہلا موقع تھا جب اس نے ٹھاکر صاحب کے منہ سے ایسے میٹھے شبد سنے تھے، پتی کی موت، پنڈتائن کی پھٹکار، بچے کی بھوک، دو وقت کے فاقے نے اسے زندگی سے بیزار کر دیا تھا۔ ٹھاکر صاحب کی باتوں میں ڈھارس کا رنگ دیکھ کر اس کا دل اُمنڈ پڑا اور وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی، ٹھاکر صاحب نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "ٹھکرائن کو بھی بہت دکھ پہنچا ہے رمئی نے ہم لوگوں کے ساتھ بڑی بھلائیاں کی تھیں، اس کی بے وقت موت پر ہم سبھوں کو افسوس ہے۔ اسی رنج کو بھلانے کیلئے ٹھکرائن میکے چلی گئی ہیں، چار چھ دنوں میں آجائینگی، آج سے تم اس گھر میں للّہ کی دیکھ بھال کیا کرو، میں تم کو کھانے کپڑے دیا کروں گا۔

للّہ ٹھاکر کے اکلوتے لڑکے شیر سنگھ کا بچہ تھا، ننھا منھا دو برس کا پیارا بچہ، سکھ دئی اُسے بڑے لاڈ پیار سے دیکھنے لگی، وہ اسے نہلاتی دھلاتی، کاجل لگاتی اور چھوٹی چھوٹی کہانیاں سناتی، سکھ دئی تن من سے للّہ اور اس کی ماں کی سیوا کرنے لگی وہ للّہ کو اپنے "منو" سے زیادہ ماننے لگی، ٹھاکر صاحب کی اس مہربانی پر وہ دل سے شکر گزار تھی کہ انھوں نے اس کی ایسی کٹھن گھڑی میں مدد کی، مگر اس سے زیادہ وہ اس خیال سے خوش تھی کہ ٹھکرائن کا دل بڑا سیدھا اور کومل ہے۔ وہ ٹھاکر صاحب سے بھی زیادہ اس پر ترس کھائیں گی، وہ منانے لگی" بھگوان! ٹھکرائن جلدی آجائیں، نہ جانے بیچاری کا اب کیا حال ہوگا؟

(۳)

ٹھاکر صاحب کی بہو سکھ دئی کو بہت ماننے لگی، اس کا پریم دیکھ کر اسے ایسا معلوم ہوا جیسے اُسے بڑی بھاری دولت مل گئی، اور وہ ایسا کیوں نہ سمجھتی، اس کا دل پریم کا پیاسا تھا، شیر سنگھ دو سال ہوئے پولیس میں بھرتی ہوئے تھے، پولیس کی نوکری تھی، چھٹی کم ملتی تھی بیچارے اکیلے "کان پور" میں رہتے تھے، مہراج کھانا پکاتا تھا، ایک نوکر اور تھا، انھیں کسی چیز کی کمی نہ تھی، ماہانہ تنخواہ کے علاوہ "دستِ غیب" بھی تھا۔ کانپور ایسے شہر میں جہاں تھوڑے تھوڑے عرصے پر جوے ہوتے رہتے ہیں اوپر کی آمدنی کا کیا حساب؟ پھر بھی شیر سنگھ خوش نہ تھے، وہ جب اپنے کوارٹر میں آتے تو انھیں ہر طرف سناٹا محسوس ہوتا، ان کا للّہ انھیں چہلیں کرتا ہوا دکھائی نہ دیتا، ان کی "شریکِ زندگی" "آہٹ پر کان در پہ نظر" جمائے گھر میں نہ ملتی، وہ سوچنے لگے "کیا ان کی زندگی ایسی ہی "بے مزہ" کٹ جائے گی"؟

یہی آگ بہو کے دل میں بھی لگی تھی، مگر اُف نہ کر سکتی تھی، وہ ہزار پڑھی لکھی سہی، مگر تھی تو ایسی ہی ساس کی بہو جو پرانی "ریت رسم" کی جیتی جاگتی تصویر تھیں، اسے اچھی طرح یاد تھا کہ جب وہ پالکی سے پہلے پہل اس گھر میں اتری تھی تو کسی نے چھینک دیا تھا، پہروں اُسے پالکی ہی میں بیٹھنا پڑا۔ کئی گلاس پانی سے کلی کرائی گئی، پنڈت جی بلائے گئے" پوجا ہوئی" "ہوم" "ہوا" "دکشنا" دی گئی اور نتیجے میں ٹھاکر صاحب کے پانچ روپے بگڑ گئے۔ یہ تھی ایک چھینک کی برکت ......
غریب بہو ان بے ڈھنگے ماحول میں جوں توں زندگی گزار رہی تھی، بیچاری کی جان آفت میں تھی، "من مناؤ" کون کرتا؟ "شیر سنگھ تو" بدیس چھائے" تھے، ساس سے پٹتی نہ تھی، ٹھاکر صاحب کی "کھوئی محبت" بھی کم ہونے لگی تھی، اور کیوں نہ کم ہوتی جب ٹھکرائن صبح وشام ان کے کان بھرتیں غرض ایسے عالم میں کہ جب بیچاری بہو پریم کی بھوک سے بے کل تھی، سکھ دئی کا پریم اُسے "نعمت" معلوم ہوا تو حیرت کیا؟
سکھ دئی کو ٹھاکر کے گھر میں آئے ہوئے ساتواں دن تھا کہ سکھ دئی نے بہو سے پوچھا "کاؤ لّلا کی ماں! ملکن آج نہ آئی ہیں؟" بہو نے حسرت لہجے میں جواب دیا "میکے میں لوگ روک لے ہوں گے، بہت دنوں کے بعد گئی ہیں، اتنی جلدی کیسے آ .... بہو کا پورا جملہ ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ باہر یکے کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی، ٹھاکر صاحب نے پکارا، "سکھ دئی! ملکن آگئیں، سکھ دئی خوشی سے جھومتی اٹھی، دوڑتی ہوئی یکے کے پاس پہنچی۔ اور ٹھکرائن کو اندر لوا لائی، گھر میں پہنچتے ہی سکھ دئی نے ٹھکرائن کی چادر اتاری اور ایک پلنگ پر بیٹھا کر باتیں کرنے لگی۔
سکھ دئی۔ اماں! میکے میں سب برائی اچھی طرح ہیں نا؟"
ٹھکرائن۔ ہاں سب لوگ اچھے ہیں، تم کب سے یہاں ہو؟"
سکھ دئی۔ سات دن سے اماں! ہم روج رستہ دیکھت رہن، کہیں، کون دن ہوئی جب اماں کا درشن ہوئی، لاؤ اماں! بدن داب دئیں، تھکی ماندی آوت ہو۔
ٹھکرائن پلنگ پر لیٹ گئیں، سکھ دئی ہاتھ پاؤں دابنے لگی، ٹھکرائن غوطے میں پڑ گئیں "اسکی کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ میرے جاتے ہی ٹھاکر صاحب نے سکھ دیا کو نوکر رکھ لیا کیا اسی لئے میرے میکے جانے پر خوشی خوشی تیار ہو گئے تھے؟ میں سمجھ گئی، ضرور دال میں کالا ہے" یہ خیال دل میں جماتے ہی اُن کی آنکھیں غم اور غصے کی شدت سے سُرخ ہو گئیں، انھیں محسوس ہوا کہ جسم سے سکھ دئی

سکے ہاتھ نہیں مس ہو رہے ہیں، بلکہ ہزاروں بچھوؤں کے زہریلے ڈنک رگ رگ میں پیوست ہوتے چلے جاتے ہیں، اس خیالی اذیت سے وہ چونک پڑیں، سکھ دئی نے گھبرا کے پوچھا" کیا ہے اماں؟ مگر ٹھکرائن نے کوئی جواب نہ دیا اور دوسری کروٹ پھر کے سوچنے لگیں، "سکھ دئی کا رہنا ٹھیک نہیں، اسے جلدی ہی نکال باہر کرنا چاہیئے" یہ انھوں نے طے کر لیا اور مگر کس طرح اور کیونکر نکالا جائے؟ یہ سوال ذرا ٹیڑھا تھا، انھوں نے سوچا" رمئی کو بلا کے اپنا شبہہ ظاہر کریں، مگر اس میں بات پھیل جانے کا اندیشہ تھا جس کے نتیجے میں ٹھاکر صاحب کی بدنامی، خفگی اور کشیدگی رکھی تھی، انھوں نے جی میں کہا" نہیں یہ ٹھیک نہیں ہے کوئی دوسرا ہی حیلہ تراشنا ہوگا"! .... ٹھاکر صاحب کی کھڑاؤں کی کھٹ پٹ سنائی دی، ٹھکرائن جلدی سے اٹھ بیٹھیں، ٹھاکر صاحب نے نرم آواز میں کہا" میں نے للہ کی دیکھ بھال اور تمہاری سیوا کے لئے سکھ دئی کو رکھ لیا ہے، اب تمہارا جی نہ گھبرائیگا، ٹھیک ہے نا؟ یہ سنتے ہی ٹھکرائن کڑھ گئیں، خیال ہوا" دیکھو آتے ہی جلانا شروع کر دیا۔ منہ بنا کر بولیں" سب ٹھیک ہے، دو چار کو اور رکھ لونا" ٹھکرائن کے پاؤں پر چلتے ہوئے سکھ دئی کے ہاتھ رک گئے، ٹھاکر صاحب باہر جاتے ہوئے بولے" نہیں سکھ دئی بڑی محنتی ہے، تمہاری اچھی طرح سیوا کرے گی اور کسی کی ضرورت ہی نہیں" سکھ دئی کا مضمحل چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کا یہاں رہنا اماں کو برا معلوم ہوا۔ اس کی مسرتوں کی دنیا غم سے بھر گئی، امیدوں پر پانی پھر گیا، ہنستا ہوا چہرہ اتر گیا، اس کی صبح پھر شام بن گئی۔

اس کے دوسرے دن، صبح کے وقت ٹھکرائن اشنان کر رہی تھیں کہ ایک کوا مکان کی چھت پر آ بیٹھا، اور کاؤں کاؤں کرنے لگا، ٹھکرائن نے کہا" کسی کا خط آتا ہو تو اڑ جا" کوا فوراً اڑ گیا، جلدی جلدی اشنان سے فارغ ہوئیں، بہو کے پاس آئیں بولیں" آج میری داہنی آنکھ پھڑک رہی ہے، یہ اشگن ہے، آج کہیں سے خط ضرور آتا ہوگا، تم نے دیکھا؟ میں نے جیسے ہی کوئے سے پوچھا وہ اڑ گیا"

ٹھاکر صاحب" جل پان" کر کے باہر نکلے ہی تھے کہ ڈاکیہ نے لفافہ دیا، ٹھاکر صاحب نے جلدی سے چاک کیا، پورا خط پڑھنے کے بعد کھٹ پٹ کرتے، بے کھانسی کے کھانستے بار بار کہتے" میں آتا ہوں، میں آتا ہوں، مکان میں داخل ہوئے، گویا طوفان میل کا انجن آرہا تھا کہ ایک اسٹیشن پہلے" لائن کلیر" کر دینا ضروری تھا، بیچاری بہو چوہیا کی طرح ایک گوشے میں جا دبکی۔

ٹھاکر صاحب ....سنتی ہو شیرو کی ماں ! شیرو کا خط آیا ہے۔
ٹھکرائن ـــــــ میں تو جانتی ہی تھی کہ آج کسی کا خط آئے گا، ہاں۔ بھیّا تو اچھا ہے نا ؟"
ٹھاکر صاحب ـــــ ہاں اچھا ہے، اس نے لکھا ہے کہ کسی کو وہاں بھیج دیا جائے، اس کو تکلیف ہوتی ہے تو بہو کو کیوں نہ بھیج دیا جائے ؟"
ٹھکرائن نے تیور بدل کر کہا "تمہیں کچھ سمجھ بھی ہے ؟ بہو کو بھیج کر لڑکے سے بھی ہاتھ دھوؤں! بہو اور للّہ جب اس کے پاس پہنچ جائیں گے تو پھر وہ ہمیں پوچھ چکا۔"
ٹھاکر صاحب ـــــ تو پھر تمہیں چلی جاؤ۔
ٹھکرائن کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ مگر وہ غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولیں "لکھ دو کسی چھٹی میں چلے آؤ، سب بات طے ہو جائے گی۔"
ٹھاکر صاحب "" اچھی بات" کہتے باہر چلے گئے اور اسی وقت خط لکھ کے ڈاک کے حوالہ کر دیا۔
ٹھکرائن نے آج کی بات سے بھی اچھی طرح تاڑ لیا کہ ٹھاکر صاحب ان کا گھر میں رہنا پسند نہیں کرتے، وہ انھیں شیر سنگھ کے پاس بھیجنا چاہتے ہیں، انھوں نے قطعی طے کر لیا کہ اب ایک منٹ بھی سکھ دئی کا رہنا ٹھیک نہیں" سوچتے سوچتے ایک تدبیر سوچ نکالی۔
ٹھکرائن ـــــــ سکھ دئی ! جاؤ ہمارا کمرہ لیپ ڈالو۔
سکھ دئی بڑی خوش ہوئی، اسے ٹھکرائن کے حکم میں "رضامندی" کی جھلک نظر آئی، وہ فوراً بولی "اچھا سرکار" اور کام میں دھیان سے لگ گئی، . . . . پورے ڈیڑھ گھنٹے کی محنت کے بعد کوٹھریاں، کمرے اور دالان لیپ کے سکھ دئی ابھی باہر گئی تھی کہ ٹھکرائن نے شور کیا "میری قمیص کی جیب میں پانچ روپے تھے، کس نے لئے ؟ زور و شور کے ساتھ "تفتیش" ہونے لگی، ایسی تفتیش کہ ڈاکہ اور قتل میں بھی کم ہوتی ہوگی، ہنگامے کی آواز سن کر ٹھاکر صاحب دوڑے ہوئے آئے، لال پیلی آنکھیں دکھا کر ٹھکرائن نے کہا "سکھ دئی چور ہے، ابھی میں نے کمرہ لیپنے کو کہا، میری قمیص کی جیب سے پانچ روپے اڑا لئے، ایسے ڈاکو ہیں یہ نوکر کہ دن دھاڑے لوٹتے ہیں ؟ ٹھاکر صاحب نے سکھ دئی کو بلایا اور نرمی سے کہا "دیکھو سکھ دئی ! صاف صاف بتا دو، تمہارے سوا اور کون لے سکتا ہے، آج تمہیں اس کمرے میں گئی تھیں "سکھ دئی سارے جسم سے کانپ رہی تھی، اس کا دل بیٹھا جاتا تھا، اس کی آنکھوں میں بے پناہ اندھیرا بھرتا جاتا تھا، اس نے

اس نے گرفتہ آواز میں کہا " سرکار! اُسے ایک لڑکا ہے، اُسے کی قسم کھا کے کہت ہوں کہ ہم روپیہ آنکھ سے نہیں دیکھا، کہیں جائے تو "گنگا" اٹھا لیئیں " جیکر اتنا بڑا احسان تیہی کے ہاں چوری ؟ ہمار کہاں ٹھکانا لاگی ؟ یہ کہہ کے وہ رونے لگی، ٹھاکر صاحب کا دل مان گیا کہ سکھ دئی "بے گناہ" ہے، "مگر ہنگامہ" دور کرنے کے لئے انھوں نے یہی مناسب سمجھا کہ سکھ دئی نکال دیجائے۔ انھوں نے کام چھوڑ دینے کا حکم دیا، سکھ دئی آنسو بہاتی بہو کے پاس پہنچی، بولی "بہو جی"! سرکار ہم کا نکال دیہن، اب ہم جات ہیں، پھولو پھلو، مُورا لَلّہ جُگ جُگ جئے " بہو کی آنکھوں میں آنسو آگئے، لَلّہ نے جو اپنا نام سُنا تو کھیل چھوڑ کے کمرے سے باہر نکل آیا، سکھ دئی نے دونوں ہاتھ پھیلا دئے۔ وہ مسکرا کے گود میں پہنچ گیا، مگر آنسو دیکھ کے وہ بھی گھبرایا بولا " تاتی " وتی ہے، "تھی تھی" " دچاچی " ! روتی ہے چپی چپی) سکھ دئی غم واندوہ کے عالم میں بھی مسکرا دی اور ممتا بھری محبت سے متوالی ہو کر لَلّہ کا منہ چوم لیا، پھر اس کے دل کی آہوں اور آنکھ کے آنسوؤں نے لَلّہ اور بہو کو " الوداع " کہی اور سکھ دئی اپنے منہ کو سئے جھونپڑے کی طرف چل دی۔

۴

سکھ دئی کو ٹھاکر صاحب کا گھر چھوڑے ہوئے آج دس دن ہو گئے تھے، اس کی عجیب حالت تھی، اس کا نصیب بگڑ کے بنا اور بن کے پھر بگڑ گیا، وہ ایک اندوہناک "رسوائی" سے دوچار تھی سب کچھ تو لٹ چکا تھا، ایک "ایمان" تھا وہ بھی ٹھکرائن نے لوٹ لیا، گاؤں بھر میں خبر پھیل گئی تھی بچے بچے کی زبان پر سکھ دیا کی چوری کی داستان تھی، جدھر جاتی جھنڈ کے جھنڈ لڑکے اکٹھا ہو جاتے "چور چور" کہہ کے ٹھٹھا مارتے، اسے کام ملنا تو درکنار، بھیک پانا بھی دشوار ہو گیا، جس در پر جاتی، چور بدکار، ڈائن کہہ کے دھتکار دی جاتی ؛

آج دو دن سے دانہ اُسے نہیں ملا تھا، بچہ بھوک سے بلک رہا تھا، سکھ دئی کو اپنی فکر نہ تھی، مگر اپنے "لال" کا بلکنا دیکھ نہ سکتی تھی، اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا، ممتا کے جوش سے وہ بے کل ہو رہی تھی، آخر وہ پاگل ہو گئی، جبھی تو رات کے بارہ بجے ہاتھ جوڑ کے ایشور سے پرارتھنا کی " بھگوان! اس طرح بچوا کو کاہیں مارت ہو ؟ اب دھکا اٹھا لو " اور بھگوان نے بھی اس کی پکار، سن لی سُنتا کیوں نہ، وہ آدمی کی طرح بے رحم تھوڑے ہے، دوسرے ہی دن بچہ شدید بخار میں مبتلا ہوا اور چوتھے دن بارہ بجے رات کو اپنے باپ کی گود میں جا پہنچا ؛

اسی کی صبح کو ٹھکرائن کی بھی حالت نازک تھی، سکھ دئی کو نکلوا کے انھیں چین نہ ملا، ان کے دل میں رہ رہ کے ایسا درد اٹھتا کہ تڑپ جاتیں، آنکھ کے سامنے اندھیرا چھا جاتا، یہ سب کیوں ہوتا تھا؟ ٹھکرائن کسی سے بتا نہ سکیں، مگر یہ اندرونی فکر ان کا کلیجہ کھائے جاتی تھی۔ وہ ہر گھڑی پریشان رہتیں انھیں کھانا پینا نہ سوجھتا، اس غیر معمولی "فکر" سے پہلے ان کی طبیعت کچھ خراب ہوئی، کنوار کے دن تھے، راتوں کو شبنم میں سوئیں، نزلے نے زور پکڑا، کھانسی تیز ہوئی، بخار بڑھ گیا، سینہ جکڑ گیا، حالت بُری ہو گئی، ٹھاکر صاحب نے ڈاکٹر بلایا، اس نے نبض، دل، پھیپھڑے کا معائنہ کیا اور کہا "ڈبل نمونیہ" ہے، بچ جائیں تو بڑی بات ہے، بہت احتیاط کی جائے" ٹھاکر صاحب نے گھبرا کر بیٹے کو تار دے دیا، وہ ہفتے بھر کی چھٹی لے کر دوسری ہی صبح کو آ گئے۔

ٹھکرائن نے بیٹے کو پاس بلایا اور کھانس کھانس کے کراہ کراہ کے ٹھاکر صاحب کے چال چلن کی کہانی سنائی اور آخر میں کہا "بیٹا! میں چاہے رہوں یا نہ رہوں تم سکھ دیا کو گھر میں نہ آنے دینا"

شیر سنگھ ——— کون سکھ دیا ؟

ٹھکرائن ——— رسی کی عورت !"

شیر سنگھ ——— تو رسی کو بلا کے کیوں نہ سمجھا دیا ؟

ٹھکرائن نے کھانسی کو ضبط کرتے ہوئے رک رک کے کہا "کیسے کہتی ؟ بات پھیل جاتی، خاندان بدنام ہو جاتا"

شیر سنگھ ـ فکر نہ کرو اماں! میں سب ٹھیک کئے دیتا ہوں، کلو کو بلا کے شیر سنگھ نے کہا۔ جا رسیا کو بلا لا" کلو نے حیرت سے پوچھا "رسیا کون رسیا .... بابو!

شیر سنگھ نے بگڑ کے کہا "رسی نائی، اور کون ؟" کلو نے دھیمی آواز میں جواب دیا "وہ تو بھیا ایک مہینہ ہوا مر گیا"

ٹھاکر صاحب دوا کی شیشی لئے کمرے میں داخل ہوئے، شیر سنگھ نے حیرت کیسا تھ سوال کیا "پتا جی! کیا رسی نائی مر گیا" ٹھاکر صاحب نے کہا "ہاں غریب مر گیا، اسی کا دکھ تو تمہاری ماں کو اتنا ہوا کہ ہمیں ان کو میکے بھیجنا پڑا، بیچارہ رسی "کتنا پریمی" تھا۔

ٹھکرائن کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں، ان کا دل دھک دھک کرنے لگا، وہ سارے جسم سے کانپ کے بولیں "شیرو بھیا! میں کیا سن رہی ہوں ؟ کیا رسیا مر گیا ؟ پھر مجھے اس کی موت

کا بڑا دکھ کب ہوا؟ یہ کہتے کہتے اُن کا دم پھول گیا، اور انھوں نے ضعف کی شدت سے آنکھیں بند کرلیں،
۔۔۔۔۔ ٹھاکر صاحب دوا کی شیشی لئے پلنگ کے بالکل قریب آئے، اور حیرت سے بولے "شیرو کی ماں! کیا تمہیں اس وقت یاد نہیں کہ کلوا کو ایک دن ہم نے مارا تھا، اس رات کو کچھ عورتیں رمیّ کی موت کی باتیں کر رہی تھیں، میں نے چاہا کہ انھیں پاس بلا کے سارا حال زبانی سنوں، مگر کلوا نہیں گیا، وہ میرے چال چلن پر شبہہ کرنے لگا، مجھے غصہ آگیا، میں نے کھڑاؤں سے اس کی خبر لی، جب تمہیں اُس کی موت کا حال معلوم ہوا تو تم روتی ہوئی میرے کمرے میں آئیں، پھر تمہارا جی ایسا گھبرایا کہ میکے چلی گئیں، اس بیچ میں مجھے معلوم ہوا کہ سکھ دیا بھوکے مر رہی ہے تو رمیا کا خیال کرکے میں نے اُسے اپنے ہاں نوکر رکھ لیا، مگر اس پاپن کی نیت ہی بگڑ گئی۔

ٹھکرائن نے آنکھیں کھول دیں، گویا گہری نیند سے چونک پڑیں، ان کی آنکھوں کے دونوں گوشوں سے آنسو بہنے لگے، انھوں نے بیحد کمزور آواز میں آہستہ آہستہ کہا"

"بس بس، معاف کردو میں نے بڑا پاپ کیا، تمہارے چال چلن پر شبہہ کیا، سکھ دیا پر جھوٹا الزام رکھا، اُسے گھر سے نکلوا دیا، ایک یتیم بیوہ کی روٹی لی، وہ بے قصور ہے، میں ہی پاپن ہوں، ہائے اب کیا ہوگا؟ شیرو بیٹا! اُسے بلا دو، مرنے سے پہلے۔۔۔۔ میں اس سے
۔۔۔۔۔۔ معافی مانگ لوں"

ہر طرف سناٹا چھایا تھا، ہر ایک، دوسرے کا منہ تک رہا تھا، سب "غلط فہمی" کے شکار تھے"
شیرو سنگھ نے ماں کے آنسو پونچھتے ہوئے بھرائی آواز میں کہا، فکر نہ کرو ماں! جلدی سے اچھی ہو جاؤ، سکھ دیا کو پھر بلا لیا جائیگا، وہ پہلے کی طرح پھر رہے گی۔۔۔۔۔۔۔ ٹھکرائن نے الٹی سانس لیتے ہوئے بمشکل کہا۔۔۔۔ "نہیں۔۔۔۔۔۔ بیٹا۔۔۔۔۔۔ جلدی۔۔۔۔۔۔
بلا۔۔۔۔۔۔ دو۔۔۔ اور بے ہوش ہوگئیں"

شیر سنگھ نے کلوا کو بلایا اور کہا "جا جلدی سے سکھ دیا کو بلا لا۔۔۔۔۔۔۔۔۔
وہ آدھ گھنٹے کے بعد واپس ہوا تو ٹھکرائن کو عارضی طور پر ہوش آگیا تھا، کلو نے ہچکتے ہوئے کہا، سرکار پرسوں رات اس کا بچہ مر گیا، صبح سویرے اس کے ساتھ وہ بھی ندی میں ڈوب مری
۔۔۔۔۔۔۔ ٹھکرائن نے ایک "ہائے" کی اور ہمیشہ کے لئے "چپ" ہوگئیں"

(شمیم کرمانی)

غزل

بلند از جفا و وفا ہو گئے ہم — محبت سے بھی ماورا ہو گئے ہم
اشاروں اشاروں میں کیا کہہ گئے وہ — نگاہوں نگاہوں میں کیا ہو گئے ہم
ترے دل میں رہ کر نظر میں سما کر — تمنائے ارض و سما ہو گئے ہم
محبت کی کچھ تلخیوں کی بدولت — مغنیٔ شیریں نوا ہو گئے ہم
سمجھنا ترا کوئی آساں ہی ظالم — یہ کیا کم ہے خود آشنا ہو گئے ہم
صدا دو محبت کے تاریخ داں کو — کہ پھر سے اسیرِ بلا ہو گئے ہم
چٹکنے نہ پائی تھیں کلیاں چمن میں — کہ اس جانِ گل سے جدا ہو گئے ہم
گھنے مست بالوں کا بہروپ بھر کر — ترے بازوؤں تک رسا ہو گئے ہم
جو ابھرے تو طوفانِ سیلاب بن کر — جو ڈوبے تو رازِ بقا ہو گئے ہم
مشیت کو خاموش دیکھا تو بڑھ کر — یہ نامِ خودی ناخدا ہو گئے ہم
تباہی بھی ہے اک نشانِ ہدایت — لٹے اس قدر رہنما ہو گئے ہم
جنونِ خودی کا یہ اعجاز دیکھو — کہ جب موج آئی خدا ہو گئے ہم
نہیں کم یہ ہستی کی معراج ساغر — کہ خاکسترِ میکدہ ہو گئے ہم

(غیر مطبوعہ) — ساغر نظامی

ہم نے جنہیں چھوڑا ہے وہ اب بھی ہمارے ہیں
جیتی ہوئی بازی کو ہم جان کے ہارے ہیں

وہ حسن مجسم ہیں میں عشق مکمل ہوں
میں اُن کا سنوارا ہوں وہ میرے سنواری ہیں

ہے پچھلا پہر ہم ہیں اور اُن کا تصور ہے
کس درجہ حسیں اس دم لمحات کے دھارے ہیں

ہونٹوں پہ تبسم ہے آنسو ہیں سر مژگاں
کھلتی ہوئی کلیاں ہیں ہنستے ہوئے تارے ہیں

جن سادے سے جملوں کی تشریح ہے ناممکن
وہ اُن کی نگاہوں کے معصوم اشارے ہیں

راتوں کو چمکتے ہیں ارمان حسیں بن کر
یہ داغ نہیں دل کے ڈوبے ہوئے تارے ہیں

اک اُن کے نہ ہونے سے اللہ رے تنہائی
دنیا میں تو ہیں لیکن دنیا کے کنارے ہیں

ابتک کسی مرکز پہ دم بھر بھی نہیں ٹھہریں
نظریں ہیں نذیر ان کی یا وقت کے دھارے ہیں

نذیر بنارسی

(غیر مطبوعہ)

دارالعلوم دیوبند کا ماہانہ رسالہ

"دارالعلوم"

مدت مدید سے مخلص اور دیندار مسلمان اپنے دینی وعلمی مرکز دارالعلوم دیوبند کی طرف سے ایک علمی ومذہبی رسالہ کے اجراء پر مصر تھے۔ الحمد للہ کہ ان کی یہ آرزو پوری ہوگئی۔ اور بلاواسطہ دارالعلوم کی ملکیت واکابر علمائے دیوبند کی سرپرستی ونگرانی میں رسالہ "دارالعلوم" جاری ہوگیا۔

رسالہ کے معیار کی بلندی اور اس کی خوبیوں کا اندازہ صرف اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اس میں جماعت دیوبند کے جلیل القدر علماء کے بیش قیمت مضامین مسلسل شایع ہوں گے۔

رسالہ "دارالعلوم" کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ مسلمان جس صحیح اور قابل اعتماد مذہبی رہنمائی کی امید اپنے مذہبی مرکز دارالعلوم دیوبند سے رکھتے ہیں اُسے صرف یہی رسالہ پورا کرسکتا ہے۔

اس رسالہ کا کوئی تعلق کسی شخص کی ذات سے نہیں بلکہ براہ راست دارالعلوم سے ہے یہی اس کی سلامتی اور استحکام کی سب سے بڑی ضمانت ہے مخلص اور دیندار مسلمانوں سے توقع ہے کہ وہ اس رسالہ کے معاونین میں شامل ہونا اپنا ایک ضروری جماعتی فریضہ تصور فرمائیں گے کاغذ وغیرہ کی انتہائی گرانی کے باوجود سالانہ چندہ صرف دو روپیہ ہے نمونہ مفت طلب فرمائیں۔ وی۔ پی طلب کرنے کے بجائے اپنا اور اپنے احباب کا چندہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں۔ (عبدالوحید ناظم و مرتب رسالہ دارالعلوم دیوبند)

نوٹ

وی۔ پی کے لئے چار آنے کے ٹکٹ آنے ضروری ہیں، اور نمونے کیلئے دو آنہ کے ٹکٹ۔

"مینیجر"

چشم بینا

(سید علی جواد اکبر آبادی)

پیارے رشید،

تمہارا مکتوب جمیل موصول ہوا۔ میری طرف سے جوابِ خط میں تعویق تم میری بے توجہی پر محمول کرتے ہو گے۔ تمہارا خیال ہو گا کہ خورشید تمہیں بھول گیا ہے۔ لیکن یقین مانو رشید تمہیں بھول جانا ہی بالکل بھول گیا ہوں۔ خط و کتابت کی تاخیر کا سبب فراموش کاری نہیں بلکہ وہی خود فراموشی ہے جس سے تم بیزار اور میں مانوس۔ بات یہ تھی رشید کہ میں اپنے خشک فلسفہ (بقول تمہارے) اور تلخ تجربات و مشاہدات سے تمہارے رنگین اور کیف آور لمحات کو غمگین اور بے کیف بنانا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن بعض اوقات انسان کو اپنی خواہش کے خلاف بھی کسی کام کے کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ تمہارا خط آیا ہوا پڑا تھا بھلا کیسے ممکن تھا کہ میں جواب نہ دیتا —— تم لکھتے ہو کہ بے ثباتیٔ دنیا کیا ہے؟ تغیر و تبدل ہی دنیا کے دوسرے نام ہیں اور اس دنیا میں رہ کر انسان کو آئے دن انقلابات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بقول شاعر:۔

ہر ایک سانس میں پنہاں ہے انقلاب جہاں ٭ بدلتے دیر نہیں لگتی اس زمانے کو

پھر بے ثباتیٔ دنیا کیسی اور اس کا شکوہ کیا — پیارے رشید تمہارا یہ کہنا سب کچھ صحیح۔ میں بھی تو تغیر و تبدل اور انقلابات زمانہ کو بے ثباتیٔ دنیا سے تعبیر کرتا ہوں۔ لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ تم اس تغیر سے متاثر نہیں ہوتے۔ تم پر یہ انقلابی دور اثر انداز نہیں ہوتا۔ لیکن میں . . . . آہ میرے لئے دنیا کا ہر انقلاب عبرت کی ایک زندہ تصویر ہے جسے دیکھنا میرا شغل اور جس کا تصور میرا ایک دلچسپ مشغلہ،

رشید! انقلابات زمانہ تمہارے مشاہدے میں بھی آتے ہیں (اور جس سے تم منکر بھی نہیں ہو) لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ تم انہیں دیکھتے ہوا ور نظر انداز کر دیتے ہو میں انھیں دیکھتا ہوں اور عبرت حاصل کرتا ہوں، تمہارا قول ہے کہ زندگی نام

"کسب لذات کا" اور تم انھیں کے حصول کے لئے کوشاں۔ اور یہی حصول شادمانی وکامرانی تمہارے لئے باعث
خوشی ہیں کسب لذات کے خوفناک انجام پر نظر رکھتا ہوں اور اسی کے تصور میں غرق اور یہی تخیل انجام میرے لئے باعث تمکنت
وطمانیت۔ پیارے رشید! تم نے ہی مجھے کیا کیا خطابات عطا کئے ہیں۔ کبھی تم مجھے
"سادہ لوح" کہتے ہو اور کبھی "سادہ فطرت"۔ "درس اخلاق کا معلم" یہ تمہارا ہی خطاب تو
دیا ہوا ہے نا؟ تو پھر میں کہتا ہوں رشید! کہ تم میری طرح کیوں نہیں بن جاتے۔ کیا درس
اخلاق کی معلمی تمہیں پسند نہیں؟ اگر پسند ہے تو پھر تم اُسے کیوں نہیں اختیار کرتے اور اگر
نہیں تو آخر وجہ گریز کیا؟ کیا اخلاق کی تکمیل ہی انسانیت نہیں ہے۔ رشید تم کلیوں کے
تبسم سے حظ اٹھانا چاہتے ہو لیکن شاید تمہیں یہ احساس نہیں کہ کلیوں کا مسکرانا ہی
ان کی حیات کا تبسم آخرین ہے۔ اس کے بعد وہ ایک شگفتہ پھول بن جائینگی۔ تم نورس
پھولوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہو۔ حالانکہ ان کی شادابی ہی ان کی فنا کا پیش خیمہ ہے۔
تم رنگ رنگ کے پھول اپنے دامن میں جمع کرتے ہو اور پھر اپنے دل میں مسرور و مطمئن ہو۔
رشید! کیا وہ پھول جو آج تمہارے دامن کی رونق ہیں کل بھی زیب دامن ہو سکیں گے۔
نہیں بلکہ یہی پھول جو آج تر و تازہ اور باعث دل بستگی ہیں کل خشک اور محروم۔ رنگ
بو ہوں گے۔ پھول تم بھی چنتے ہو اور میں بھی مگر تم صرف شباب بہاری کے گلچیں ہو اور
یہ تقاضا ہے تمہاری بہار شباب کا۔ لیکن میں خزاں کے موسم میں بھی پھول چن لیتا
ہوں مگر یہ وہ گلہائے رنگیں نہیں ہیں جو تمہارے لئے نظر فروز اور دلفریب ثابت ہوں۔
رشید! میرے تخیلات کی اجنبیت کا تمہیں پہلے ہی اعتراف تھا۔ اب دیوانہ
بھی کہنے لگو گے۔ لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میری یہ دیوانگی (برا نہ ماننا رشید) تم جیسے
ہوشیاروں کی فرزانگی سے بدرجہا بہتر ہے۔ اور چلتے چلتے میں تم کو یہ بھی بتادوں کہ وہ پھول کیا
ہیں جو میں خزاں میں چنتا ہوں لیکن انھیں دیکھنے کے لئے چشم بینا کی ضرورت ہے۔ چونکہ
خط ضرورت سے زیادہ طویل ہو گیا ہے اس لئے میں اسے اس شعر پر ختم کرتا ہوں۔
اس سے اندازہ لگا لو اور بس۔

چشم بینا نے بہرصورت چُنے گلشن سے پھول
کچھ خزاں ہوتے سے پہلے کچھ خزاں ہونیکے بعد

فقط۔ تمہارا خورشید

بومیرنگ

BOOMERANG

(سید ناظم علی، بی۔ اے، دریاآبادی)

بومیرنگ ایک خاص قسم کا ہتھیار ہوتا ہے، جس کو افریقہ کے حبشی اور وحشی، اور اسٹریلیا کے صحرائی عام طور پر شکار میں استعمال کرتے ہیں، اور یہ چیز انھیں لوگوں کی ایجاد بھی ہے۔ مہذب دنیا کی تواریخ میں کہیں کسی زمانہ میں اس انوکھے ہتھیار کا رواج نہیں پایا گیا ہے، اس سے بآسانی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ چیز غالباً انھیں وحشیوں ہی کی دماغی پرواز کا نتیجہ ہوگی، جو اُن کی ضروریات کے مقابلہ کے لئے اُن کے حالات کے تحت ظہور میں آئی۔ دنیا کے مختلف حصوں کے وحشی باشندے اس متمدن زمانہ میں بھی بکثرت بومیرنگ استعمال کرتے ہیں، بلکہ صحرائے کانگو کے اکثر باشندوں کا واحد حربۂ شکار یہی ہے۔ مصر کی بعض قدیم یادگار عمارتوں کی دیواروں پر اکثر جگہ ایسے نقش دیکھنے میں آئے ہیں، جن میں کچھ ایسے انسانی پیکروں کی تصویریں ہیں، جو اس حالت میں دکھلائے گئے ہیں کہ گویا بومیرنگ نما ٹیڑھی لکڑیاں پھینک رہے ہیں۔ یہ نقوش چار چار ہزار برس کے پرانے ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بومیرنگ کا رواج سطح ارض پر اُس وقت سے ہو کہ جب دنیا میں تہذیب کی صبح بھی نہیں ہوئی تھی، اور کیا تعجب ہے کہ سب سے پہلا شکاری ہتھیار بومیرنگ ہی ہو۔ بہت ممکن ہو کہ باہمی لڑائی میں یہ ہتھیار استعمال ہوتا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ بومیرنگ وحشیوں کا اوزار ہے لیکن جس اصول پر اس کی تخلیق ہوئی ہے، وہ وحشیانہ نہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ وحشیوں کو بھی اتنی دور کی سوجھے کہ حکماء اس کا اعتراف کریں۔ تعجب ہے کہ ہمارے شکاری اپنی سوسائٹی میں رائفل اور بندوق وغیرہ کے بجائے یا کم ازکم ان چیزوں کے ساتھ ساتھ بومیرنگ کا پرچار کیوں نہیں کرتے جس میں نہ کوئی بار ہے نہ بوجھ، اور جس میں نہ بارود کا جھگڑا نہ کارتوس کا جھنجھٹ، نہ لائسنس کا کھڑاگ!! ۔ اور سب سے بڑھکر یہ کہ جنگ اور گرانی کے اثرات سے محفوظ!!

اپنے ہاتھ سے بومیرنگ بنانے کی ترکیب یہ ہے کہ مضبوط سخت اور بھاری لکڑی کا ایک ٹکڑا لیجئے، دو فیٹ لمبا، ڈیڑھ انچ چوڑا اور ½ انچ موٹا۔ اس کا ایک سرا چپٹا دھار دار چھری کی طرح تیز اور دوسرا سرا موٹا گول اور چکنا ہونا چاہئے۔ اب اس لکڑی کو درمیان میں اس طرح

جھکائیے کہ ۱۲۰ درجہ کا زاویہ وسط میں بن جائے، لیکن شرط یہ ہے کہ زاویہ کی دونوں راستیں ایک ہی سطح میں رہیں۔ لکڑی کے کناروں کی دھاریں مار دیجئے اور پورے ٹکڑے کو خوب رگڑ رگڑ کر چکنا کرلیجئے۔ بس بومیرنگ تیار ہوگیا۔ یہ ہے ایک "معیاری بومیرنگ"۔ اس کی اور ایک دیسی بومیرنگ کی ساخت میں کافی فرق ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ وحشی بومیرنگ سے وہ ساری خدمات ادا نہیں ہوتیں، جو معیاری بومیرنگ سے ہو سکتی ہیں، اور جن کی ایک بومیرنگ سے توقع کی جاتی ہے۔ آگے چلکر ہم دیکھیں گے کہ دونوں کے فعلوں میں کیا فرق ہوتا ہے"۔

بومیرنگ کی شکل اور اس کا کام دلچسپی سے خالی نہیں۔ جہانتک اس کی شکل کا تعلق ہے، ظاہر ہے کہ کوئی عجوبۂ روزگار چیز نہیں، لیکن اس کی خوبیوں پر نظر کیجائے تو حیرت ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب بومیرنگ کو کسی شکار پر پھینکتے ہیں، تو اس کو زخمی کرنے کے بعد پھینکنے والے کے پاس از خود پھر واپس آجاتا ہے۔ جانور کو زخمی کرنا اور زخمی کرنے کے بعد شکاری کے پاس پھر واپس آجانا، کیا یہ تعجب کی بات نہیں ؟! یقیناً اگر بومیرنگ میں یہ دونوں صفتیں بیک وقت ساتھ ساتھ ہوتیں، تو یہ بڑے ہی اچنبھے کی چیز ہوتا، لیکن تجربہ شاہد ہے کہ عموماً ایسا نہیں ہوتا۔ وحشیوں کے بومیرنگ بھدے اور بے ڈول ہوتے ہیں، اس سبب سے ان میں وہ ساری خوبیاں نہیں ہوتیں، جو متذکرۂ بالا سائنٹیفک طریقہ پر بنے ہوئے بومیرنگ میں ہو سکتی ہیں۔ جانور کو زخمی کئے بغیر تو ہر طرح کا بومیرنگ خواہ وہ معیاری بومیرنگ اور سائنٹیفک ہو یا غیر معیاری اور وحشیانہ، شکاری کے پاس خود بخود واپس آسکتا ہے اور عموماً آجاتا ہے، بشرطیکہ اُس کے پھینکنے کے طریقہ میں کوئی نقص نہ واقع ہوا ہو۔ مگر درمیان میں کسی چیز (جانور یا چڑیا وغیرہ) سے ٹکرانے اور اس کو بسمل کرنے کے بعد بھی اگر وہ پھینکنے والے تک اپنے آپ پہنچ جائے، تو یہ واقعی بومیرنگ کا کمال ہے لیکن ثابت ہوچکا ہے کہ یہ حال کسی اچھے سے اچھے بومیرنگ میں بھی ممکن نہیں۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ جب تیزی میں بھرا ہوا متحرک بومیرنگ اپنے راستہ میں کسی چیز سے متصادم ہوتا ہے، تو یقیناً اس کا رُخ تبدیل ہوجاتا ہے، جس کے باعث یا تو حرکت کی قوت بالکل سلب ہو جانے سے وہ وہیں گر کر رہ جاتا ہے، یا اگر کمزور رفتار سے آگے بڑھتا بھی ہے تو اصولاً اس منزل تک نہیں پہنچ سکتا، جہاں سے روانہ ہوا تھا۔ پہلی صورت اسوقت واقع ہوتی ہے، جبکہ وہ کسی بھاری بھر کم چیز (مثلاً ہرن، نیل گائے، بارہ سنگھا، سانبھر وغیرہ) سے ٹکراتا ہے، اور ایسی صورت میں بومیرنگ یا تو اُسی جانور کے بدن میں پیوست

ملیگا یا کہیں آس پاس ہی پڑا ہوگا۔ آخر الذکر صورت ایسے موقع پر ظہور میں آتی ہے، کہ جب بومیرنگ کسی ہلکے پھلکے جانور (مثلاً خرگوش، بلی، اُود بلاؤ وغیرہ) یا کسی چھوٹی چڑیا پر پھینکا جاتا ہے۔ اِس صورت میں شکاری کو اپنے ہتھیار کی تلاش میں قدرے دقت ہوتی ہے۔ یہ تو ہم جانتے ہی ہیں کہ اگر نشانہ خطا ہوا ہے اور بومیرنگ اپنی راہ میں کسی ٹھوس چیز سے ٹکرایا نہیں ہے، تو وہ پھینکنے والے کے پاس ضرور لوٹ آئیگا۔ بہرحال تینوں صورتوں میں بومیرنگ محفوظ واپس ملجاتا اور ضائع نہ ہوتا (گولی، تیر یا غلّہ کے برعکس) بالکل یقینی ہے، اور یہ بومیرنگ کا سب سے بڑا کمال اور سب سے بڑی خوبی ہے۔

اب اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ بومیرنگ میں یہ خوبی بھی پیدا ہوجائے کہ شکار کو چوٹ دینے کے بعد از خود پھینکنے والے کے پاس واپس لوٹ آئے۔ تو اسکے لئے دو شرطیں ضروری ہیں۔ اوّل تو بومیرنگ کچھ اس وضع کا بنایا جائے کہ درمیان میں پڑنے والی سخت سے سخت چیز کے بملنا سے بھی بلا کسی رُکاوٹ کے بآسانی پار ہوسکے۔ دوسرے اُسکے پھینکنے میں اتنی قوت اور ہوشیاری صرف کیجائے کہ راہ میں کسی چیز سے تصادم ہونے پر وہ اپنا رُخ نہ بدلے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں میں سے کسی شرط کا پورا ہونا ممکن نہیں، پس "آئیڈیل بومیرنگ" کی امید محض موہوم ہے۔ تاہم بومیرنگ کی موجودہ خوبیاں ہی اِس درجہ قابل قدر ہیں کہ بومیرنگ کو ہرگز ایک بیکار چیز کے مترادف نہیں کہا جاسکتا۔ اکثر بازیگر وقتی کا بومیرنگ مجمع عام میں پھینک، کر اپنے پاس واپس بلا لیتے ہیں۔ بعض ہوتے ہیں کہ وہ تاش کا معمولی پتہ اس طرح ہوا میں اُچھالتے ہیں کہ وہ چکر لگا کر پھر اُنھیں کے قدموں میں آگرتا ہے۔ عوام سمجھتے ہیں کہ یہ بھی شاید کوئی جادو یا نظر بندی ہے۔ لیکن اگر غور کریں تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجائیگی کہ واپس لوٹ آنیوالے تاش کے اس فعل میں سائنس کا وہی راز مضمر ہے، جو وحشی کے بومیرنگ کی حرکات میں پوشیدہ ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ بومیرنگ واپس کیوں آجاتا ہے؟ نیز یہ کہ اگر بومیرنگ کے بجائے آپ اپنی چھڑی یا رول کسی خاص طریقہ سے پھینکیں، تو کیا وہ بھی اپنے آپ بومیرنگ کی طرح چکر لگانے کے بعد آپ کے پاس واپس لوٹ آئے گا؟ سب سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھ لینی چاہئے کہ بومیرنگ کو پھینکنا بھی ایک بڑا آرٹ ہے۔ بڑی مشکل سے آتا ہے، اور بڑی پریکٹس مانگتا ہے۔ ہر شخص بومیرنگ نہیں چلا سکتا۔ اور بلا کافی مشق و مہارت کے کوئی اس کے کامیاب استعمال پر حاوی نہیں ہوسکتا۔

بومیرنگ کو ہاتھ سے چھوڑتے وقت دو باتوں کا خیال رکھنا اشد ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ زیادہ سے زیادہ طاقت اور جھٹکے کے ساتھ اس کو ہاتھ سے جدا کیا جائے، دوسرے یہ کہ اس ترکیب سے پھینکا جائے کہ یہ زور سے ناچتا ہوا چلے۔ اگر ناچتا چکر کھاتا ہوا نہ چلا، تو پھر نہ اس کی رفتار میں ہمواری ہوگی اور نہ زیادہ فاصلہ طے کر سکے گا۔ بومیرنگ کا دور تک جانا اور پھر لوٹ کر آجانا محض اسی وجہ سے ہے کہ یہ ناچتا ہوا چلتا ہے۔ اور آخر تک ناچتا ہی رہتا ہے۔ چنانچہ اس کا یہ "رقص" بڑی اہم چیز ہے۔ بومیرنگ میں زاویہ کا جو خم ہوتا ہے، اس سے اس کے رقص میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اگر خم نہ ہو تو رقص دیر پا اور مسلسل نہ رہ سکے گا یہی سبب ہے کہ چھڑی یا رولر جیسی سیدھی لکڑیاں، خواہ کتنے ہی زور اور جھٹکے سے پھینکی جائیں، ہرگز لوٹ کر نہ آئیں گی۔ یہ بات ضرور ہے کہ اگر ایک سیدھی لکڑی کو اس طرح پھینکا جائے کہ رقص کیساتھ روانہ ہو، تو یہ یقیناً معمولی طور پر پھینکنے کی بہ نسبت بہت زیادہ فاصلہ طے کر سکیں گی۔ لیکن چونکہ اس میں خمدار نہ ہونے کی بنا پر رقص کو برقرار رکھنے کی صلاحیت موجود نہیں ہے۔ اس لئے نہ زیادہ دیر تک متحرک رہ سکیگی، نہ بہت دور تک پہنچ سکے گی۔ اور نہ لوٹ کر آسکے گی۔ یہی سبب ہے کہ بومیرنگ کا خمیدہ ہونا ضروری ہے۔ لیکن رہا یہ سوال کہ کس قدر خم مناسب ہوگا؟ اس کا فیصلہ ایک سائنسداں اچھا کر سکے گا بہ نسبت ایک وحشی کے۔

بومیرنگ کے فعل کی کامیابی کا انحصار اس کے پھینکنے کے کرتب پر بھی ہے۔ جس وقت وہ شکاری کے ماہر ہاتھ سے چھوٹتا ہے، اسی وقت سے زمین کی قوت کشش کا اثر اس پر ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ چونکہ وہ بڑی قوت اور سخت جھٹکے سے چھوڑا گیا ہے، اس لئے نسبتاً بہت زیادہ دیر بعد قوت کشش کا اسیر غلبہ ہو پاتا ہے۔ پھر اس کے علاوہ چونکہ وہ رقص کرتا ہوا چلا ہے۔ اس لئے اور بھی دیر کے بعد وہ قوتِ کشش سے متاثر ہوتا ہے۔ اتنے عرصہ میں گویا اسکو معمولی صورت کی بہ نسبت بہت زیادہ دوری تک پہنچ جانیکا موقع ملجاتا ہے۔ بہرحال ایک وقت آتا ہے کہ جب اس کا سارا زور جس کو لیکر وہ چلا تھا۔ بالکل ختم ہو جاتا ہے، اور اس کی وہ حرکت جو اس کو شکاری کے ہاتھ سے ملی تھی سب کی سب زائل ہو جاتی ہے۔ اگر خاص وجہیں مانع نہ ہوتیں، تو یقیناً بومیرنگ زمین کی جانب جھکنا شروع ہو جاتا (اسی صورت کو ہمارے شکاریوں کی اصطلاح میں "گولی کا لٹک جانا" کہتے ہیں۔) کوئی دوسری چیز معمولی طریقہ سے پھینکی ہوئی ہوتی، تو اس موقعہ پر زمین کی طاقت سے مغلوب ہو کر اسی وقت اور اسی جگہ

زمین پر آرہتی، لیکن بومیرنگ ایکدم سے نہیں گر پڑتا۔ باوجود اس کے کہ اس کی حرکت کی قوت ختم ہو چکی ہے، لیکن چونکہ اس کا رقص بدستور ہے، اس لئے وہ اسی سطح پر واپس ہونا شروع کر دیتا ہے۔ جس پر گیا تھا۔ رقص کے ساتھ حرکت کرنیوالی چیز کا خاصہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی سطح تبدیل نہیں کر سکتی۔ یہی سبب ہے کہ بومیرنگ اسی راستے سے واپس آتا ہے۔ جس سے وہ روانہ ہوتا ہے۔ پھینکنے والے کی طرف نہ لوٹتے ہوئے کسی دوسری جانب رخ کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ جس سطح پر حرکت کر رہا ہے، اس سے گریز کرے، لیکن رقص کی حالت میں یہ اصولاً ناممکن ہے۔ بس یہی سبب ہے کہ وہ پھینکنے والے ہی کی طرف پھر لوٹ کر آجاتا ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ یہ خوبیاں اسی اور محض اسی بومیرنگ میں ہو سکتی ہیں، جسکی ساخت صحیح اصول کے ماتحت ہوئی ہو۔

آسٹریلیا کے غریب وحشی کو شکار کے بعد ایک بڑی مصیبت ہر مرتبہ یہ ہوتی تھی کہ لمبی لمبی گھاس اور دریائی دل دل میں یا خاردار گھنی جھاڑیوں کے اندر اپنے تیر ڈھونڈے۔ اس تکلیف سے بچنے کی تدبیر کا وہ عرصہ سے متلاشی تھا۔ ٹیڑھی لکڑیوں کے متعلق وہ بارہا یہ تجربہ کر چکا تھا کہ ان میں واپس لوٹ آنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ بومیرنگ کی اتفاقیہ ایجاد نے اس بیچارے کو اس مصیبت سے نجات دلائی۔ سچ ہے ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔

نئے خریداروں سے

اضطراب کے نئے خریدار لکھنؤ کے پتے کی رسیدیں بیکار سمجھیں، بنارس کے پتے کی رسیدیں قبول فرمائیں۔ رسیدوں کی پشت پر "مینیجر اضطراب بنارس" کی مہر ہوگی۔ اور سید محمد عمر صاحب رضوی گونڈوی کے دستخط ہوں گے۔

"مینیجر"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

ذہن کی اصلاح کے لئے اچھی کتابوں کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ ہماری بکڈپو سے
ہر قسم کی ادبی، سیاسی، تاریخی اور مذہبی کتابیں مناسب قیمت پر فروخت کیجاتی
ہیں جسکی فہرست دفتر سے طلب کیجئے۔ آپ اپنے ذوق کے مطابق کتابیں
منتخب کر کے ہمارے یہاں سے حاصل کر سکتے ہیں۔ ہمارے مکتبہ میں
انگریزی، ہندی اور اردو کا بہترین اسٹاک موجود ہے۔
ہندوستان کی کسی بک ڈپو کی کوئی کتاب پسند کریں۔
تو مجھے ضرور یاد کریں۔ اصلی قیمت پر تمام کتابیں
مہیا کیجاتی ہیں۔ سید محمد عمر رضوی گونڈوی منیجر و معتمد

مطبوعات۔ مکتبہ "ادبستان" پانڈے حویلی بنارس

منظومات:۔

نورس قسم اول، مجلد عے } مسعود اختر جمال صاحب جمال
نورس قسم دوم مجلد عہ } (اڈیٹر اضطراب) کی زندگی بخش نظموں کا دلولہ انگیز مجموعہ۔
آنیوالے انقلاب کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ آپ زندگی کی نئی قدروں کو پہچانیں اور اس زمانے میں
جبکہ دنیا جنگ کی ہولناکیوں سے زیر و زبر ہو رہی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ مستقبل کی تعمیر و تشکیل
میں آپ کی مدد کرے گا۔

حدیث حسن مجلد:۔ از ماسٹر نظرت واسطی۔ قیمت عہ

قومی گیت مجلد:۔ قیمت عہ } تمام مشاہیر شعرائے انقلاب کے نادر کلام۔ یعنی
آزادی اور انقلاب:۔ } مزدور اور کسان۔ بے بسی اور بیکسی کی دنیائے
استبداد اور سرمایہ داری کے مظالم پر حریت نواز نظموں کا مجموعہ۔ قیمت عہ

پیام کیف:۔ مجموعہ کلام مرزا احسان احمد صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ وکیل

اعظم گڈھ باہتمام جناب مولوی مسعود علی صاحب ندوی۔ مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ۔
موصوف کی ذات دنیائے ادب میں محتاج تعارف نہیں مشہور مصنف مقدمہ "نشاط روح"
(مجموعۂ کلام اصغر گونڈوی مرحوم) قیمت ۱۲؍

جواہراتِ حفیظؔ جونپوری :- اول تو ہمارے خیال میں حفیظ جونپوری اور ان کی شاعری محتاج تعارف نہیں۔ سوا سو شعروں کا یہ مختصر انتخاب پہلے دیوان کی غزلوں سے کیا گیا ہے۔ جو نہ صرف حفیظ مرحوم کی شاعرانہ عظمت کا گواہ ہے۔ بلکہ ایک حد تک ان کی زندگی کا آئینہ دار بھی ہے۔ مرتبہ نظام صاحب جونپوری۔ قیمت ۳؍

رباعیات سحابی :- مؤلفہ جناب مولوی علی اوسط صاحب اعظم گڈھی ڈسٹرکٹ و سشن جج صوبہ متحدہ (ریٹائرڈ) مؤلف نے ایک نوٹ، موازنہ اور حالات کا بھی دیا ہے۔ غرض کہ مؤلف اس اجتماع کرنے کے سلسلہ میں لائق صد مبارک باد و تحسین ہیں۔ قیمت ۱۰؍

میرے نغمے مجلد :- از سلام صاحب مچھلی شہری۔ موصوف ان جوان شعراء میں سے ہیں جو ادب کو زندگی سے قریب تر دیکھنا چاہتے ہیں۔ جو تمام نظام معاشرت میں مساوات کے حامی ہیں۔ اور جو سیاسی تنظیم کو پلٹ کر ایسے نظام کے حامی ہیں جس میں ہر ایک کو برابر کے مواقع ملیں۔ نہ کوئی ظالم ہو نہ مظلوم نہ آقا ہو نہ خادم نہ کوئی سرمایہ دار ہو نہ کوئی مزدور۔ قیمت ۱۲؍

مغز نغز :- مثنوی مولینا روم علیہ الرحمہ کا عارفانہ انتخاب ہے۔ جسے حضرت مولینا ابوبکر محمد شیث صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے نہایت کاوش سے منتخب کیا ہے۔ اہل دل حضرات جلد توجہ فرمائیں۔ ورنہ دوسری اشاعت کا انتظار کرنا پڑے گا۔ قیمت ۱؍

کلیان :- اردو کی سلیس اخلاقی نظمیں۔ از طالب صاحب الہ آبادی۔ پبلشر رائے صاحب لالہ رام دیال صاحب۔ اگروالہ۔ قیمت ۸؍

افسانے :-

نئی زندگی مجلد :- نسیم صاحب سندیلوی اور وجاہت صاحب سندیلوی کے چھ چھ افسانوں کا دلکش مجموعہ ہے۔ جو آپ کے حال اور مستقبل کا آئینہ دار ہے۔ قیمت ۱۲؍

آغاز خیال :- نسیم صاحب سندیلوی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ قیمت ۸؍
کاروانِ دلیل :- The Fellowship of Reason کا ترجمہ۔ از نسیم سندیلوی قیمت ۱؍

کشمکش :- از فخر ایم۔ اے۔ موصوف کی عمر ابھی انیسؔ سال ہے۔ انھوں نے اس سال ہی ایم۔ اے پاس کیا ہے۔ یہ افسانے اور مضامین انھوں نے اسکول اور کالج کے مصروف گھنٹوں کے درمیان لکھے ہیں۔ جوان طالب علموں کیلئے صد رشک ہے۔ ایک دفعہ از راہ ادب نوازی یا حوصلہ افزائی ضرور زحمت مطالعہ گوارا فرمائیں۔ قیمت ۸؍

ذکر و فکر :- یہ مقصود زاہدی صاحب کے سماجی، سیاسی اور نفسیاتی چھوٹے چھوٹے گیارہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ جس میں وہ مطالعے خصوصیت کیساتھ جاذب توجہ ہیں۔ جو نفسیاتی جزئیات نگاری پر مبنی ہیں۔ شروع میں ساغر نظامی صاحب نے ایک مختصر سا تعارف بھی لکھا ہے۔ قیمت ۸؍

خونی کی پہچان :- از طالب صاحب آلہ آبادی پبلیشر رائے صاحب رام دیال اگروالہ۔ قیمت ۱۰؍

انوکھے جادوگر :- از طالب صاحب الہ آبادی۔ پبلیشر رائیصاحب رام دیال اگروالہ قیمت ۸؍

مذہبیات :-

مولود خطابیول :- یعنی حضرت رسول اکرم صلعم کی حیات مبارک کے حالات۔ ولادت سے ہجرت تک۔ مرتبہ۔ حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب شروانی رئیس دتاولی ضلع علی گڈھ۔ ممبر مسلم یونیورسٹی کورٹ، سابق ممبر سنڈیکیٹ جامعہ ملیہ، ناظم جمعیت الخلافتہ صوبہ آگرہ وغیرہ وغیرہ۔ قیمت عہ

اسلامی خلافت کا کارنامہ :- حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب شروانی رئیس دتاولی ضلع علی گڈھ۔ ممبر مسلم یونیورسٹی کورٹ، سابق ممبر سنڈیکیٹ جامعہ ملیہ، ناظم جمعیت الخلافتہ صوبہ آگرہ وغیرہ وغیرہ قیمت عہ

الاسلام :- مشتمل بر عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق و محبت رسولؐ، مؤلفہ مولوی محمد آمین صاحب ٹیچر پیل کالجیئٹ اسکول بلرام پور ضلع گونڈہ (اودھ) قیمت ۵؍

خلاصتہ الامانی لابی بکر شیث فی مصطلحات اصول الحدیث — حدیث کے سلسلے میں ایک خلاصہ رسالہ ہے۔ از مولوی ابوبکر محمد شیث۔ قیمت ۲؍

عربی قاعدہ :- ابتداً اس قاعدہ کے ذریعہ حرف شناس کرائے گئے ہیں ملنے والے حرفوں کے جوڑ اور ان کی مختلف صورتیں اچھی طرح ذہن نشین کرنے اور امتحانی حرفوں کے ذریعہ خود فہمی کا

عادی بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ از مولوی ابوبکر شبیث۔ قیمت ار
مفید الاطفال :۔ عربی قاعدے کے بعد سلسلہ دینیات کا پہلا نمبر ہے۔ اذان، نماز پنجگانہ، نماز جنازہ وغیرہ کی ماثورہ دعاؤں کا مجموعہ۔ مؤلفہ مولینا الحاج مولوی حافظ ابوبکر محمد شیث فاروقی مرحوم مہتمم مدرسہ قرآنیہ جامع مسجد جونپور۔ قیمت ار
دینی تعلیم :۔ حصہ عقائد مع احادیث اخلاق و رفاق از مولینا ابوبکر محمد شیث مرحوم قیمت صرف ۴ر
اسلامی تہذیب :۔ از مولینا ابوبکر محمد شیث مرحوم۔ قیمت صرف ۲ر
عقائد اسلام :۔ اہل سنت کے متفقہ اسلامی عقائد کا مجموعہ جو قرآن پاک اور صحیح حدیثوں سے اسّی سال پہلے ترتیب پاکر متعدد بار شایع ہو چکا ہے۔ سلیس زبان میں مسلمان بچوں کے لئے ایک مفید اضافہ ہے۔ مؤلفہ مولینا ابوبکر محمد شیث فاروقی مرحوم سابق ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔ قیمت ۱ر
نماز کی کتاب :۔ طہارت، وضو، اذان، نماز جمعہ، تراویح، عیدین، نماز جنازہ اور ان کے متعلقہ مسائل پر حضرات لاافاضل مولینا الحاج مولوی ابوبکر محمد شیث صاحب فاروقی مرحوم کی مختصر لیکن جامع تصنیف ہے۔ سلسلہ دینیات کا دوسرا نمبر ہے۔ قیمت صرف ۳ر
روزہ کی کتاب :۔ سلسلہ دینیات کا تیسرا رسالہ مؤلفہ مولوی ابوبکر محمد شیث صاحب فاروقی مرحوم۔ قیمت ۳ر
تحفہ اعتکاف :۔ مسائل اعتکاف اور رویت ہلال کے متعلق مؤلفہ مولوی ابوبکر محمد شیث صاحب فاروقی مرحوم۔ قیمت صرف ۱ر
سیرۃ الرسول :۔ سلسلہ دینیات کا پانچواں رسالہ مرتبہ مولینا الحاج مولوی ابوبکر محمد شیث صاحب فاروقی مرحوم سابق ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔ قیمت ۱۲ر
دینی تعلیم مکمل :۔ یعنی سلسلۂ دینیات کا مجموعہ مرتبہ مولینا الحاج مولوی ابوبکر محمد شیث صاحب فاروقی مرحوم سابق ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڈھ۔ رعایتی قیمت صرف عہ
تقویم الاوقات للصوم والصلوٰۃ :۔ یعنی اسلامی دوامی جنتری مرتبہ مولینا الحاج مولوی ابوبکر محمد شیث صاحب مرحوم فاروقی قیمت ۱ر

ضرورت رسالت دوامی حصّہ اول :۔ اس رسالہ میں مسئلہ نبوت و رسالت کے تمام پہلو دلائل عقلیہ و نقلیہ سے واضح کئے گئے ہیں۔ مؤلفہ مولینا الحاج مولوی ابوبکر محمد شیث صاحب فاروقی مرحوم سابق ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔ قیمت ۶/

ضرورت رسالت حصّہ دوم :۔ اس میں خاص جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے افضل الرسول و خاتم الانبیا ہونے کی تشریح ہے۔ اور ان دونوں حصوں میں اصل مسئلہ کی تشریح کے علاوہ مخالفین اسلام کی تردید بھی نہایت مدلل طریقہ سے کیگئی ہے۔ خصوصاً مرزائیوں اور عیسائیوں کی۔ مؤلفہ۔ خادم العلماء سلطان محمود عفا اللہ عنہٗ صدر مدرس مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی۔ قیمت ۶/

خطبوں کا مجموعہ اور دیہات میں جمعہ کا جواز } از حضرت مولانا ابوبکر محمد شیث فاروقی مرحوم قیمت ۸/

تقوی :۔ از مولوی ابوبکر محمد شیث صاحب فاروقی مرحوم۔ قیمت ۳/

سیاسیات و متفرقات

غیر ملکی حکومت کے کرشمے :۔ قیمت ۲/

جمیعۃ العلماء مسلم لیگ اور کانگریس :۔ قیمت ۲/

سوانح حیات مع خطبہ صدارت مولانا آزاد :۔ قیمت ۳/

سفر نامہ مظہری :۔ یعنی مرحوم حاجی مظہر علیم انصاری۔ رودلوی۔ سفیر آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس و انجمن ترقی اردو وغیرہ کے چہاردہ سالہ روزنامچہائے سفر کا عطر۔ مرتبہ محمد حلیم انصاری صاحب رودلوی اردو میں سفرنامے کی جو کمی ہے ایک حد تک اسنے بہت دور کیا ہے۔ سنا ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب نے بھی اپنی کسی تحریر میں مرحوم حاجی مظہر علیم صاحب انصاری کے کارناموں کو سراہا ہے۔ قیمت عہ

مقدمہ ادب اردو :۔ از طالب صاحب الہ آبادی پبلشیر رائے صاحب رام دیال صاحب اگروالہ آلہ آباد قیمت ۱۲/

اینگلو پرشین ٹرانسلیشن :۔ ہائی اسکول طلبا کے لئے بہت مفید ہے۔ از مولوی اظہر علی صاحب فاروقی لکچرر فارسی اودے پرتاب . . . . انٹر کالج بنارس قیمت ۱۰/

رس ساغر مجلد :۔ حضرت ساغر نظامی صاحب کا ہندی کلام کا مجموعہ۔ قیمت عہ

المشتہر :۔ سید محمد عمر رضوی گونڈوی منیجر و معتمد

۱۹۴۲ء کا شاندار ادبی کارنامہ

چمنستان کا سالنامہ

جنوری ۴۲ء کے وسط میں ہندوستان کے مشہور و محبوب ترین ماہنامہ چمنستان کا سالنامہ نہایت آب و تاب سے شایع ہو رہا ہے۔ انتہائی کوشش سے چوٹی کے لکھنے والوں سے بہترین مضامین، بلند پایہ افسانے، روح پرور نظمیں اور پر کیف غزلیں حاصل کی گئی ہیں۔ آرٹ کی بہترین تصاویر سے مزین۔ یہ ضخیم سالنامہ صرف دو روپے چندہ منی آرڈر سے بھیجکر مفت حاصل کیجئے۔ اپنے شہر کے ایجنٹوں سے ۸ر میں ابھی سے محفوظ کرا لیجئے۔

مینجر چمنستان۔ نکلسن روڈ دہلی

ایجنٹ حضرات اس اطلاع کے موصول ہوتے ہی بواپسی ڈاک مطلع فرمائیں کہ آپ کو کتنی کاپیاں بھیجی جائیں۔ ۲۵ر دسمبر کے بعد تعمیل نہ کی جائے گی۔ آدھی رقم آرڈر کے ساتھ پیشگی آنی چاہیئے۔

مینیجر

اعلان

حضرت نسیم صاحب سندیلوی بی۔ اے آنرز، ایم۔ اے۔ اپنی عدیم الفرصتی کیوجہ سے اضطراب کیطرف زیادہ توجہ نہیں فرماسکتے ہیں اسلئے جو صاحب کچھ دریافت کرنا چاہیں۔ براہ راست دفتر کو لکھا کریں۔ موصوف کو زحمت نہ دیا کریں۔

"منیجر"

اعلان

حضرت نسیم صاحب سندیلوی بی۔ اے آنرز، ایم۔ اے۔ اپنی عدیم الفرصتی کیوجہ سے اضطراب کیطرف زیادہ توجہ نہیں فرما سکتے ہیں اسلئے جو صاحب کچھ دریافت کرنا چاہیں۔ براہ راست دفتر کو لکھا کریں۔ موصوف کو زحمت نہ دیا کریں۔

"منیجر"

Regd-No-A662

منظور شدہ محکمۂ توسیع تعلیم یوپی گورنمنٹ (الہ آباد)

ماہنامہ شاعر بنارس

نگران :- جگر مرادآبادی

مدیر اعلیٰ :- اظہر علی فاروقی ایم اے

ا

دُعا

وہ ضُو کہ امانت ہے مری خاک میں یارب
اُس ضَو کو عطا کر تو ہم آغوشئ جبریل

ہر مفلسِ تخئیل کو آسودہ بنا دے
مدت سے گراں بے مرے افکار کی زنبیل

نا محرمِ انجام ہیں امروز کے راہی ہو
تدبیر سے گر اِن کے خیالات کو تبدیل

ہر سینۂ مردہ کو سکھا، ذوق و تب و تاب
ہر دل میں جلا دے مرے احساس کی قندیل

اِک دور نیا ہو مرے ہر خواب سے پیدا
فردا کی سحر ہو، مرے اجمال کی تفصیل

زندہ ہو، مری لذتِ تجدید سے دنیا
ہر شعر سے پیدا ہوں نوا ہائے سرافیل

ہر نقشِ حقیقت میں ہے بے رنگ وادھورا
میں چاہتا ہوں تجھ سے فقط فرصتِ تکمیل

——— فضل حسین کیف اسرائیلی

"فانی کے آبائی وطن سے"

آہ اے خاکِ بدایوں اے شمالی سرزمیں
میں! کہ اک فرزند تیرا فانیؔ اندوہگیں

اک مجسم غم تھی جس کی زندگی مستعار
دفن ہے خاکِ وطن میں آج تیرا شاہکار

غم کے بے پایاں سمندر میں بہا جاتا تھا وہ
جسکی گہرائی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا وہ

اپنے پژمردہ لبوں سے ہنس بھی لیتا تھا کبھی
یہ ہنسی ہوتی تھی اسکو ایک کھسیانی ہنسی

غم کی ہر تصویر کو اک زندگی دیتا تھا وہ
شعر کے پردے میں اپنی داستاں لکھتا تھا وہ

آج وہ تو گوشۂ تاریک میں مستور ہے
ایک عالم اسکی بزمِ خاص سے اب دور ہے

اسکی نظروں میں ہے یکساں آج پستی و فراز
کر رہی ہے آج اس سے موت بھی راز و نیاز

روح انکی شعر ہو کر گنگناتی ہے یہاں
"نغمۂ خاموش" ہو کر آگ برساتی ہے یاں

اپنی تنہائی سے جبکہ تنگ آ جاتا ہے وہ
شعر بنکر میرے لب پر کھیلتا آتا ہے وہ

صحوی

(خاص برائے اضطراب)

جلد ۲ | اضطراب | ماہ فروری و مارچ ۱۹۴۳ء
نمبر ۷ | | چندہ سالانہ صہ روپیہ
 | | قیمت فی پرچہ ۶ ر

اضطراب کیلئے یہ سال جن پریشانیوں اور دشواریوں کو اپنے ساتھ لیکر آیا اُن سے اُمید تو یہی تھی کہ شاید اضطراب اب صفحۂ ہستی پر سانس نہ لے سکے گا۔ اور جنگ کے مہیب شعلے جس طرح تمام عالم انسانیت کو اپنی زد میں لے رہے ہیں اسی طرح اضطراب بھی انھیں کیساتھ جھلس کر رہ جائیگا۔ مالی دشواریاں۔ کاغذ کی گرانی کیساتھ ساتھ کمیابی۔ معاونین قلم کی بے توجہی۔ مجلس منتظمہ کی الجھنیں سب نے مل کر بیک وقت ایسی کیفیت پیدا کر دی جس نے اضطراب کو بالکل سکتے کے عالم میں ڈال دیا۔ مگر خداوند کریم کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اضطراب آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہے اور انشاء اللہ حاضر ہوتا رہے گا جسکے لئے آپ ابتک مضطربانہ منتظر رہے ہیں۔ ہم ڈرتے ڈرتے اپنے معاونین اہل قلم سے عرض کرتے ہیں کہ اضطراب کی اشاعت میں تعاون کی تھوڑی سی ذمہ داری ان کے سر بھی ہے۔ ہم انھیں یقین دلاتے ہیں کہ انکی توجہ کے بغیر کوئی ادبی ادارہ پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ہمیں بے انتہا افسوس ہے کہ ہم قارئین کی حسب خواہش خدمت نہ کر سکے۔ جس کا سب سے بڑا سبب عمدہ مضامین کا نہ ملنا ہی کہا جا سکتا ہے۔ ہم قارئین اضطراب کو یقین دلاتے ہیں کہ جس وقت بھی مضامین کی فراہمی ہو گئی اسی وقت اس فرض سے سبکدوش ہونیکی کوشش کریں گے۔

اضطراب کا یہ نمبر جس عجلت اور پریشانی میں ترتیب دیا گیا ہے اس کا ذکر نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ پھر بھی ہم نے کوشش کی ہے کہ اس مختصر نمبر میں قارئین کی دلچسپی اور مذاق کے مطابق مضامین پیش کریں۔ ہوائی حملے سے بچاؤ موجودہ ضروریات اور حالات کے لحاظ سے ایک مفید اور عمدہ مضمون ہے جس کا مطالعہ ہر شخص کیلئے خصوصاً شہر سے تعلق رکھنے والے اصحاب کے نہایت ضروری ہے۔ تخلیق ایک نتیجہ خیز ڈراما ہے جسکو جناب شہاب سلمانی صاحب نے کامیابی سے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ پاگل ایک بصیرت افروز کہانی ہے جو ہمارے ملک میں آئے دن پیش آنیوالے واقعات کی جیتی جاگتی تصویر ہے اور یہ نریندر بہادر صاحب کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ قارئین اضطراب نریندر صاحب سے پہلی مرتبہ متعارف ہو رہے ہیں۔ موصوف ابھی ایک طالب علم ہیں اور ہونہار افسانہ نگار معلوم ہوتے ہیں۔ منظومات میں رقص کا جنازہ جناب سروش صاحب ملیح آبادی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ غالباً بزم اضطراب میں آپ پہلی مرتبہ تشریف لا رہے ہیں مگر ایک مضطرب اور حساس قلب کے ساتھ سروش صاحب بقول خود جوان یا نوجوان ہیں اور . . . جوان شاعر کو کلیجے سے لگاتے ہیں۔ وہ شاعری جسکے رخساروں سے شباب پھوٹا پڑتا ہو اور جسکی آنکھوں سے جوانی کی شراب چھلکی پڑتی ہو۔ . . . . . .

قارئین اضطراب انکی نظم رقص کا جنازہ مطالعہ فرما کر اندازہ لگائیں کہ وہ اپنے نظریئے میں کس درجہ کامیاب ہیں۔

نقد و نظر

ممالک اسلامیہ کی سیاست ۔ قومیت اور بین الاقوامیت

مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی کے پنج سالہ پروگرام کے ماتحت جن سیاسی تحریکوں اور مسائل پر کتابیں اور مقالے پیش کرنا طے کیا گیا ہے ۔ یہ دونوں کتابیں اسی سلسلے سے وابستہ ہیں پہلی کتاب جناب عشرت حسین صاحب صدیقی بی ۔ اے کی تالیف ہے جو ڈبل کراؤن سائز کے ۲۵۴ صفحات پر مشتمل ہے ۔ دوسری کتاب بھی اسی سائز کے ۱۶۱ صفحات پر مشتمل ہے ۔

اردو کتابوں کو معنوی خوبیوں کے علاوہ ظاہری خوبصورتی کیساتھ مجلد شایع کرنیکا جو فخر مکتبہ مذکور کو حاصل ہے وہ اظہر من الشمس ہے ۔ دونوں کتابوں کا گیٹ آپ عمدہ ہے پہلی کتاب کی قیمت عہ اور دوسری کی عہ ہے ۔ مکتبہ اور اس کی شاخوں سے مل سکتی ہیں ۔

پہلی کتاب میں اسلامی ممالک کے عہد بعہد کی انقلابی سیاست پر بحث کی گئی ہے ۔ جو اگرچہ بہت مختصر ہے تاہم اطمینان بخش اور پر از معلومات ہے اس کے ساتھ ساتھ تمام ممالک کے جغرافیائی نقشے بھی دئے گئے ہیں ۔ جو اس سے بہتر صورت میں پیش کئے جا سکتے تھے ۔ پھر بھی سر دست معمولی طور پر سمجھنے کیلئے اچھے ہیں ۔

اتحاد اسلام اور اتحاد عرب ۔ اسلامی ممالک اور یورپ کی حکومتیں بصیرت افروز مقالے ہیں جنکا تعلق مطالعہ سے ہے ۔ عشرت صاحب کا طرز تحریر سادہ اور عمدہ ہے ۔ مطالب نہایت خوبی سے بیان کئے ہیں ۔ مگر بعض بعض مقامات پر سادگی کی رو میں بہت سے غیر مانوس الفاظ اور فقرے نکل گئے ہیں اور مطالب کی ادائگی کا بھی یہی حال ہے ۔ مثلاً صفحہ ۱۵ پر ایران کا حدود اربعہ اسطرح بیان کیا ہے جو نہایت غیر مانوس ہے کسی جغرافیہ کی کتاب میں ایران کا حدود اربعہ اس طرح نہیں دیکھا گیا ۔ مغرب میں زاغورس کی پہاڑیاں ۔ مشرق میں اونچے اور پتھریلے ویران ۔ شمال میں روس اور جنوب میں ہندوستان . . . . . . ،، کتاب میں جا بجا طباعت اور کتابت کی غلطیاں بھی ہیں ۔

دوسری کتاب جناب محمد قاسم حسن صاحب بی ۔ اے ۔ بی ۔ ٹی کی تالیف ہے ۔ اس کتاب میں قومیت ۔ اسکے عناصر ۔ ارتقا وغیرہ سے بحث کی گئی ہے اور بعد میں بین الاقوامیت اور اسکے ارتقا وغیرہ سے بحث کیگئی ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کتاب انگریزی زبان سے ترجمہ کیگئی ہے اور اسمیں وہ تمام باتیں پائی جاتی ہیں جو آجکل کے ترقی پسند مترجموں کے کارناموں میں پائی جاتی ہیں ۔ موضوع کے لحاظ سے دونوں کتابیں قابل قدر ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ ان سے کوئی کتب خانہ خالی نہ رہنا چاہیے ۔

ہوائی حملے سے بچاؤ

ضرورت۔ آج جبکہ جنگ کے مہیب شعلے ہم سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ دشمن آزادی، حریت اور مساوات کی آڑ میں انسانیت کا گلا گھونٹ رہے ہیں۔ کتنے انسانوں اور بے زبان جانوروں پر جبر و ستم کی بارش کر رہے ہیں۔ اور اس طرح درندگی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ وہ ہوائی جہاز جنکو بنی نوع انسان نے ایک مفید اور کارآمد ایجاد سمجھا تھا۔ آج اسی سے ان کا خون بہایا جا رہا ہے۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ موجودہ جنگ میں انھیں سے گولے برسائے جاتے ہیں۔ اور ہزار ہا بے گناہ انسان موت کے گھاٹ اتارے جا رہے ہیں۔ کیا ایسے وقت میں ہمارا یہ فرض نہیں ہے کہ ان سے بچاؤ کی جو صورتیں ہو سکتی ہوں انھیں اختیار کیا جائے اور جو معلومات ہم تک پہنچی ہیں عوام تک پہنچانے کی کوشش کی جائے۔

ہماری گورنمنٹ نے پبلک کی حفاظت کیلئے اس کا ایک محکمہ اے۔ آر۔ پی، کے نام سے قائم کر دیا ہے۔ جو نہایت کامیابی سے اپنی سرگرمیوں میں مشغول ہے۔

ہم اس مختصر مضمون میں ہوائی حملوں سے بچاؤ کے بارے میں کچھ بتانا چاہتے ہیں تاکہ آپ خود اپنی حفاظت کر سکیں اور اپنے پاس پڑوس کے لوگوں کو اس خطرے سے بچا سکیں۔ اگرچہ ہماری دعا ہے کہ خدا تعالیٰ ہم سب کو اس آفت سے محفوظ رکھے۔

ہوائی جہاز۔ عام طور پر تین طرح کے ہوتے ہیں۔ (۱) بڑے (۲) منجھولے (۳) اور چھوٹے۔ ان کی رفتار تین سو میل فی گھنٹہ یا اس سے کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ اور ایک اڑان میں ۲۰۰۰ میل تک جا سکتے ہیں۔ بڑے ہوائی جہاز ۵۰ من تک بوجھ لے جا سکتے ہیں۔ ان کے حملے سے بچنے کیلئے عام طور پر ان باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔

عام ہدایتیں۔ (۱) ہوائی جہاز گولے اسی جگہ گراتے ہیں جہاں آدمیوں کا مجمع دیکھتے ہیں۔ اس لئے جنگ کے زمانے میں بہت سے لوگوں کو ایک جگہ اکٹھا نہ ہونا چاہیئے۔ (۲) جہاں تک ہو سکے رات میں روشنی بھی نہ کرنا چاہیئے۔ اور جب "بلیک آؤٹ" کا نوٹس ملے اس وقت سے تو

ہوائی کرکے روشنی نہ کرنا چاہیئے۔ (۳) کھُلے میدانوں میں گھومنا پھرنا نہ چاہیئے۔ درختوں اور گھروں کی آڑ لیکر چلنا چاہیئے۔ (۴) جن مکانوں میں شیشے لگے ہوں ان پر موٹا کاغذ یا کپڑا لگا دینا چاہیے۔ شیشے والے منزلوں میں رہنا اچھا نہیں ہے۔ (۵) مکانوں میں تہ خانے اور کھوں ہرے بنا لینا چاہیئے۔ ان میں گھس کر بیٹھنا اچھا ہے۔ (۶) اگر تہ خانہ بنانا ممکن نہ ہو تو چھ فیٹ لمبی ۲ فیٹ چوڑی اور $4\frac{1}{2}$ فیٹ گہری خندق کھود دینا چاہیئے۔ اور اس پر $1\frac{1}{2}$ فیٹ اونچا پشتہ لگا کر تختے رکھ دینا چاہیئے۔ اس قسم کی خندقوں کا انتظام سرکار کی طرف سے ہو رہا ہے۔ اس لئے جب خطرہ ہو تو اسی جگہ جا کر چھپنا چاہیئے۔ (۷) گھروں میں نیچے والے حصوں میں رہنا چاہیئے۔ اور خطرے کے وقت کسی اچھے تخت یا بڑی میز کے نیچے گھس جانا چاہیئے۔ (۸) مکان کی دیواروں اور چھتوں پر بالو سے بھرے بورے رکھنا چاہیئے۔ مکان کی دیواروں سے

بورے اس طرح لگانا چاہیئے۔ اور چھتوں پر بالو بچھا دینا چاہیئے۔ (۹) ہوائی حملے کے خطرے کی گھنٹی سنکر گھبرانا نہ چاہیئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے ہوش و حواس بجا رکھنا چاہیئے اور کسی عام حفاظت کی جگہ میں چلے جانا چاہیئے۔ اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو کسی نشیب جگہ میں لیٹ جانا چاہیئے۔ (۱۰) لیٹتے وقت اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ سینہ زمین سے الگ رہے۔ اس سے پھیپھڑے محفوظ رہینگے

دانتوں میں کپڑا یا رومال دبا لینا چاہیئے۔ اور کانوں کو بند کرنا چاہیئے۔ یہ ہیں موٹی موٹی باتیں جنکا خیال رکھنا ضروری ہے۔ (۱۱) اس کے علاوہ اگر ممکن ہو سکے تو مکانوں پر فائر پروف پالش کرا دینا چاہیئے۔ یا اس مسالے سے پتائی کرا دی جائے تو آگ لگنے سے حفاظت ہو سکتی ہے بجھا ہوا چونا ۱۰ سیر نمک $\frac{1}{2}$ چھٹانک اور پانی $2\frac{1}{2}$ پاؤ ملا کر اسی تناسب سے مسالہ کرانا چاہیئے۔
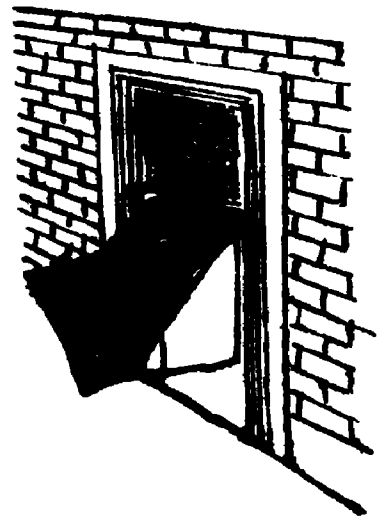
بموں کی قسمیں ۔ ہم آپ کو بم گولوں کی ڈراؤنی کہانی نہ سنانے اور اس کی مختلف قسموں کے چکر میں نہ ڈالتے مگر چونکہ یہ مصنوعی دیو اور آدم خور گولے الگ الگ خاصیتیں رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کا تھوڑا سا حال جان لینا ضروری ہے۔ یوں تو بموں کی بہت سی قسمیں ہیں مگر زیادہ تر مشہور یہ ہیں۔

(۱) بھونچال لئے یا زلزلہ خیز بم ۔ یہ گولے بڑے خطرناک ہوتے ہیں اور ان سے بچنا بہت مشکل ہے۔ ان سے بچنے کیلئے تہ خانوں۔ موں ہر دوں اور خندقوں سے بہتر کوئی صورت نہیں۔ جب یہ اس طرح کے کام کرتے ہیں، تو زمین کے اندر پانچ چھ فٹ تک دھنس جاتے ہیں۔ بڑے زور کا دھماکہ ہوتا ہے۔ زمین ہلنے لگتی ہے مکان اور دیواریں کانپنے لگتی ہیں۔ اور بھونچال کی سی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ بڑے زور کی آواز پیدا ہوتی ہے جس سے کانوں کے پردوں کو نقصان پہونچتا ہے ان سے بچنے کیلئے تخت، میز یا اسی قسم کی کسی دوسری چیز کے نیچے گھس جانا چاہئے۔ دانتوں میں رومال یا کپڑا دبا لینا چاہئے۔ کانوں کو خوب مضبوطی سے بند کر لینا چاہئے۔ لوہے کے فریموں سے بنے ہوئے مکانات بہت محفوظ ہوتے ہیں۔ مکانوں کی دیواروں کے پاس بالو کے بورے رکھنا چاہئے۔ اور چھتوں پر بالو بچھا دینا چاہئے۔

(۲) آگیا بم یا آتش ریز بم ۔ یہ بم وزن میں ایک سیر سے لیکر تین سیر تک کے ہوتے ہیں۔ چھپروں۔ کھپریل۔ سلیٹ کے ٹکڑوں اور ہلکے پتھروں سے چھائی ہوئی چھتوں پر ان کا اثر ہوتا ہے۔ ان کو توڑ کر اندر گھس جاتے ہیں۔ اور آگ لگ جاتی ہے۔ اس لئے چھتوں سے ایسی چیزوں کو ہٹا دینا چاہئے جن میں آگ لگنے کا اندیشہ ہو۔ مکان کی تمام لکڑی کی چیزوں پر فائر پروف پالش کرا دینا چاہئے۔ یا اس مسالے کو لگا دینا چاہئے جو بتایا جا چکا ہے۔ اگر اس طرح کا بم کہیں پڑا ہو اور آپ اسکو اٹھانا چاہتے ہیں تو فائر پروف کپڑے پہن کر جانا چاہئے۔ ربر یا چمڑے کے لانگ بوٹ پہنا چاہئے۔ آنکھوں پر گاگل لگانا چاہئے۔ یک ہاتھ میں "ایس بس ٹاس" کی ڈھال لے لینا چاہئے اور
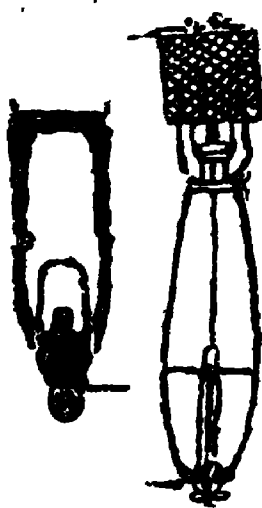
دوسرے ہاتھ میں اسکوپ پکڑ لینا چاہیئے۔ اس پر اسکوپ سے بالو ڈالتے رہئے۔ اور بالٹی میں اٹھاکر کسی دوسرے مقام پر ڈال دینا چاہیئے۔
اگر ان بموں سے مکانات میں آگ لگ گئی ہو تو اس طرح بجھانا چاہیئے۔

آگ بجھانیوالی پارٹی کیلئے ضروری باتیں ۔ آگ بجھانیوالی پارٹی کو عام طور پہ یہ کام کرنا ہوتا ہے۔ (۱) آگ بجھانا (۲) جلتی ہوئی آگ سے لوگوں کو نکالنا۔ (۳) قیمتی مال و اسباب کو بچانا۔ آگ بجھانیوالی جماعت میں چار چھوٹی چھوٹی پارٹیاں ہوں گی۔ ایک پارٹی گھڑوں اور بالٹیوں سے آگ بجھائیگی دوسری پارٹی مٹی یا بالو ڈالکر آگ کم کرے گی۔ تیسری پارٹی اسٹرپ پمپ سے آگ بجھانے کا کام کریگی۔ چوتھی پارٹی آگ کے رستے سے جلنے والی چیزوں کو دور کرے گی۔

آگ بجھانیوالی پارٹی کیلئے عام ہدایتیں ۔
(۱) جلتے ہوئے مکان کے دروازوں اور کھڑکیوں کو اس وقت تک بند رکھنا چاہیئے جب تک پوری پارٹی تیار نہ ہو جائے جانے وقت تک ان کو آہستہ آہستہ کھولنا اور بند کرنا چاہیئے۔ (۲) آگ بجھانیوالوں کو سوٹ پہن لینا چاہیئے۔ اور اگر نہ مل سکے تو دری یا کمبل لیکر اس کے بیچ میں آنکھو
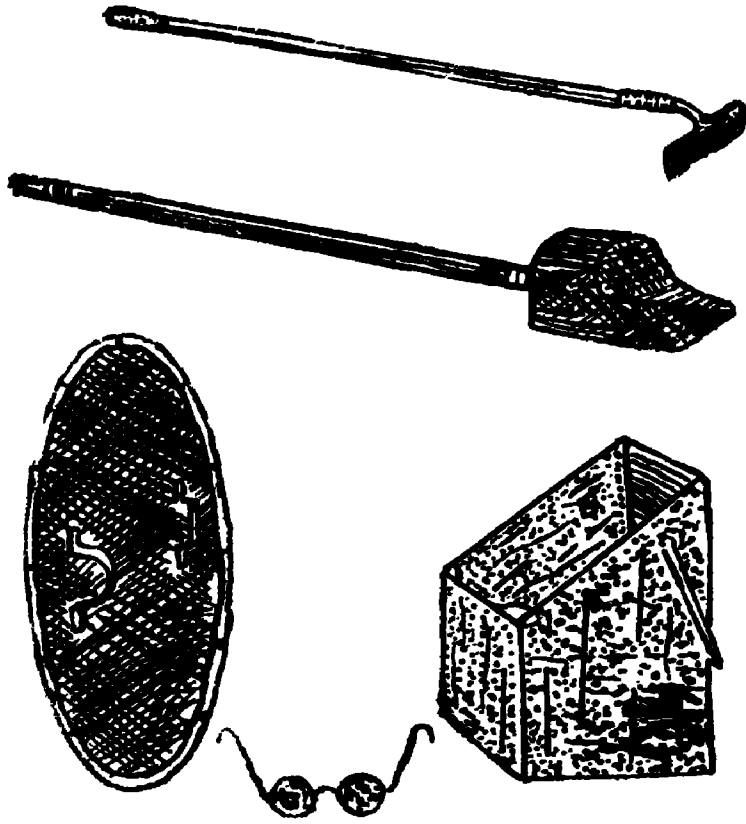
گھولنے کیلئے سوراخ کرکے خوب بھگو کر رومال ہی باندھ لینا چاہیئے۔ (۳) ہمیشہ پر خوب پانی
ڈال کر اور سرکا کر آنکھوں کے سامنے رکھنا چاہیئے گلے اور چہرے پر پانی سے بھگو کر رومال
ہی باندھ لینا چاہیئے۔ اگر سرکے اور پانی کو ملا کر لوشن بنا لیا جائے اور اس سے کپڑے
کے کونے رکھے جائیں تو کہیں اچھا ہے۔ (۴) ننگے پیر ہرگز نہ جانا چاہیئے۔ (۵) آگ بجھاتے
وقت دیواروں کے پاس سے جانا چاہیئے۔ اور فرش پر جھکے جھکے جاؤ۔ (۶) اگر کسی شخص کے
کپڑوں میں آگ لگ جائے تو اس کو زمین پر گر کر لوٹ جانے کا حکم دینا چاہیئے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے
تو اس کو ترکیب سے لٹا دینا چاہیئے۔ مگر اس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ زیادہ چوٹ نہ آجائے
اور موٹا کمبل وغیرہ یا قالین سے ڈھانک دینا چاہیئے کہ اندر ہوا نہ لگ سکے۔ پھر اس کو زمین
پر سڑھکانا چاہیئے۔ (۷) اگر اوپر کوٹھے پر آگ لگی ہے تو نیچے والے لوگوں کو ہوشیار کر دینا
چاہیئے۔ (۸) اگر کسی ایسے مقام پر آگ لگی ہے جہاں پٹرول یا مٹی کا تیل جمع ہے تو پہلے اسکو
بجھانا چاہیئے۔

پانی کی بالٹیاں ۔ اس ٹولی کو دو حصوں میں تقسیم کر دینا چاہیئے جلتے ہوئے مقام
سے پانی کے مقام تک دونوں طرف کھڑا کر دینا چاہیئے۔ ایک ٹولی پانی سے بھری بالٹیوں کو
پہنچائے۔ اور دوسری ٹولی خالی بالٹیوں کو پانی کے مقام تک پہنچائے۔ جب پانی والی
پارٹی تھک جائے تو بدل دینا چاہیئے۔ ایسا کرنے سے کام جلد اور آسانی سے ہوگا۔ اور
پانی کا سلسلہ ٹوٹنے نہ پائیگا۔

مٹی اور بالو کا استعمال ۔ اسی طرح مٹی۔ خاک دھول یا بالو سے بھری بالٹیاں
پہنچائی جا سکتی ہیں۔ مٹی کے تیل۔ پٹرول یا اس قسم کی دوسری چیزوں میں لگی ہوئی آگ کو مٹی
اور بالو ہی سے بجھانا چاہیئے۔ ان چیزوں پر پانی ڈالنا خطرناک ہے اس سے آگ اور
زیادہ بھڑک جاتی ہے۔

اس ٹولی کے لوگوں کو بالو پھینکنے اور دور تک پہنچانے کی مشق ہونا چاہیئے۔ اس کے لئے
ٹین کے کرڑے دار برتن ہونا چاہیئے جن میں بھر بھر کر مٹی یا بالو دور تک پھینکی جا سکے۔ اس کام کیلئے
سوپ بھی کام دے سکتا ہے۔

سٹرپ پمپ :- اس پمپ کو کام میں لانے کے لئے تین آدمیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔
ایک شخص پانی سے بھری بڑی بالٹی یا پانی کے حوض میں پمپ رکھ کر چلاتا ہے دوسرا بالٹی میں
پانی بھر بھر کر لاتا ہے اور پمپ رکھی ہوئی بالٹی میں ڈالتا جاتا ہے۔ تیسرا پمپ کے منہ کو آگے
بڑھاتا ہے۔ تاکہ پانی کی پھوار دور تک پہنچ سکے۔
یہ آدمی بہت ہوشیار ہونا چاہئے اور اسکے پاس فائر پروف سوٹ ہونا ضروری ہے۔
آگ لگاؤ بم پر پانی کی ہلکی ہلکی پھوار ہی پڑنا چاہئے۔ اس پر زیادہ پانی پڑ جانے سے اس کے
بھڑک اٹھنے کا اندیشہ ہے۔ یہ تینوں آدمی باری باری سے
کام کر سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں تینوں ہوشیار ہونا چاہئے۔
تاکہ تھک نہ جائیں اور کام آسانی سے ہو جائے۔

جان بچانیوالی پارٹی۔ اس پارٹی کے سامنے تین باتیں
ہوتی ہیں :۔ (۱) جلتے ہوئے مکانوں سے آدمیوں کو نکالنا۔ (۲)
کس طرح ان کو بچایا جائے۔ (۳) اگر خود آگ کی زد میں آجائے
تو کیا کرنا چاہئے۔
اس پارٹی میں کم از کم چار آدمی ہونا چاہئے۔ جن میں سے
ایک فرسٹ ایڈ میں تجربہ کار اور ماہر دوسرا اچھا سائیکل سوار۔
(۱) اگر مکان ادھر جل رہا ہے اور لوگ اوپر ہی ہیں۔ اتفاق
سے دروازے اور کھڑکیاں بند ہیں تو اس پارٹی کو اختیار ہے۔ وہ
جس طرح چاہے توڑ دے۔ کلہاڑی۔ آری۔ بسولا وغیرہ ان کے پاس
رہنا ضروری ہے۔ (۲) اگر مکان نیچے جل رہا ہے اور لوگ ادھر
چلا رہے ہیں تو ایک پتلی رسی پھینک دینا چاہئے۔ اور اس میں ایک موٹی رسی جو ...
ملا دینا چاہئے۔ اور ان میں سیڑھی کا گانٹھیں پہلے ہی سے لگا دینا چاہئے
اس رسی کو کسی کھمبے سے مضبوط باندھ دیگا یا خود نہایت مضبوطی سے
اس پارٹی کا دبلا پتلا مگر پھرتیلا آدمی اوپر چڑھ جائے گا۔ اگر ادھر ...

آگ بجھانیوالا فائر سوٹ پہنے ہوئے

ایک دوسری قسم کی گیس لوا سائٹ کہلاتی ہے۔ اس سے بھی پھپھولے پڑنے لگتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ
آنکھوں کی روشنی ہمیشہ کیلئے غائب ہو جاتی ہے۔ تیسری قسم کی گیس مس ٹرڈ گیس بھی ہے
اس سے پیاز اور لہسن کی بو نکلتی ہے۔ جسم پر پھپھولے پڑجانے کے ساتھ جلن اور سوجن پیدا
ہو جاتی ہے۔ اگر اس قسم کا کوئی مریض ہو (۱) سب سے پہلے ان پھپھولوں کو توڑ دینا چاہیئے۔
(۲) صابون سے نہلانا چاہیئے۔ (۳) اگر جلن زیادہ ہو بلیچ مرہم لگا کر صابون سے نہلانا چاہیئے۔
(۴) آنکھوں کو گنگنے پانی سے خوب دھو کر زیتون کا تیل یا کسٹر آئل ڈالنا چاہیئے۔ (۵) پھپھولوں
کے لئے اگر کوئی مجرب چیز معلوم ہو تو اسکو بھی استعمال
کر سکتے ہیں۔ جیسے السی کا تیل اور چونے کا ہلکا پانی یا خالص
مکھن اور سفید کاشغری وغیرہ۔
اس قسم کے گیس سے بچنے کیلئے ریس ریٹر استعمال
کرنا چاہیئے۔
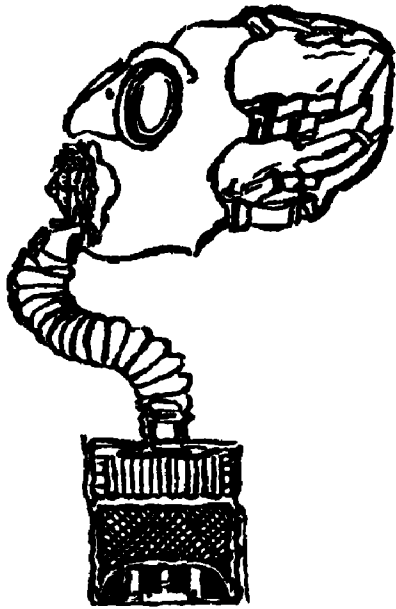
(۵) وقتی بم:- یہ گولا زمین پر گرنے کیساتھ نہیں ٹوٹتا
بلکہ کچھ وقت لیتا ہے۔ اس کے پاس کبھی نہ جانا چاہیئے
بلکہ اسکی اطلاع فوراً اے۔ آر۔ پی کے محکمے کو کرنا چاہیئے۔
وہاں کے لوگ ان آلات سے جو اس کے اٹھانے میں
کام آتے ہیں۔ اٹھا کر دور کر دیں گے۔

یہ ہے تھوڑا سا حال ان لوگوں کا جو خونخوار درندوں
سے زیادہ انسانوں کا خاتمہ کر رہے ہیں۔ کیا ایسی صورت
میں ہم سب کا یہ فرض نہیں کہ ہم سب مل کر اس محکمے کے اراکین کا ساتھ دیں۔ اور اپنی گورنمنٹ کی ہر طرح مدد
کریں جو ہم سب کو اس آفت سے بچانے کیلئے ان تھک کوشش کر رہی ہے۔ اور اس طرح اپنے
ملک اور قوم کی خدمت میں شامل ہوں جس سے بڑھ کر کوئی دوسرا کام نہیں ہے جسکے متعلق شیخ سعدیؒ نے
فرمایا ہے ؎ تو کز محنت دیگراں بے غمی ٭ نشاید کہ نامت نہند آدمی
اور اسی کو حالی نے اس طرح فرمایا ہے ؎ جو ہیں دنیا میں قوم کے ہمدرد ٭ بندۂ قوم ان کے ہیں زن و مرد

اظہر علی فاروقی۔ ایم۔ اے۔ مولوی فاضل

تخلیق

لال نورِس
مترجمہ
شہاب سلیمانی

کردار :-

جیرالڈ اسطون ——— ڈرامہ نویس

جیک رانڈیل ——— ایکٹر، اسطون کی بیٹی کا منگیتر

جین اسطون ——— اسطون کی بیٹی

ڈیل ڈولن ——— ؟ ؟ ؟

منظر

جیرالڈ اسطون کا ایک مطالعہ کا کمرہ۔ کمرہ سجا ہوا ہے نرم نرم قالین بچھے ہوئے ہیں اور ان پر آرام کرسیاں سلیقہ سے سجی ہیں۔ ایک کونے میں رکھی ہوئی ڈیسک کے برابر کا دروازہ اور فرانسیسی طرز کی کھڑکی کھلی ہوئی ہے جس میں سے باغ کا منظر نظر آ رہا ہے۔ اگست کی ایک چاندنی رات ہے اور دروازے میں سے صرف آسمان کی نیلی روشنی دکھائی دے رہی ہے۔
جیک اور جین بیٹھے ہوئے جیرالڈ اسطون کے ایک ڈرامہ کا مطالعہ کر رہے ہیں۔
یکایک جین کانپتی ہے۔

جین :- اوہ !
جیک - اُف ! مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ لیکن غضب کر دیا ہے۔ کیوں نا ؟
جین :- سچ مچ حیرت انگیز ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ابا جیسا شخص اس قسم کی چیز کیسے لکھ سکتا ہے تمہارا خیال ہے۔
جیک :- تم سمجھتی تو ہو نہیں۔ ان کے خیالات بہت بلند ہیں۔ اور ان کا دماغ تو نئے نئے

منبع ہے۔ منبع کیا تم ان کی حیرت انگیز قابلیت سے نا واقف ہو؟

جین :۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں ابا جان کی قابلیت کا اندازہ نہیں کر سکتی۔ اور ڈرامہ نگار کی حیثیت سے میں ان کے مرتبہ کو نہیں پہچانتی ——— لیکن تم ذرا ابا کی عادات و خصائل دیکھو کہ وہ کتنے بعید شعر اور کتنے نرم مزاج ہیں۔ اس کے برعکس ان کے ڈرامے یعنی ان کی تخلیقات پر غور کرو۔ وہ کتنے کریہہ اور ڈراؤنے کردار پیش کرتے ہیں ——— کیسے عجیب اور حقیقت سے کس قدر قریب! ——— کیسے خوفناک اور کیسے طاقتور ——— ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کردار ان ہی کی زندگی کا ایک جزو ہیں۔

جیک :۔ ہاں میں سمجھ گیا۔ واقعی یہ حیرت انگیز بات ہے ——— مجھے تعجب ہے ایسے تخیلات ان کے پاک دماغ میں کہاں سے آجاتے ہیں ——— اور پھر یہ کردار! ——— کتنا خوفناک ہے یہ! ——— لیکن جین اس کردار کو میں ادا کر رہا ہوں ——— کتنا سنہری موقعہ ہے!

جین :۔ یہ اچھی بات ہوئی کہ اس کردار کو تم ادا کر رہے ہو ——— وہ کتنا خوفناک کردار ہے کہ اگر تمہارے سوا کوئی اور شخص اسے ادا کرتا تو یقیناً میں "میری" کا پارٹ ادا نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ یہ ضرور اس سے متاثر ہوتی۔

جیک :۔ ہوں! ——— چھوٹی بچوں جیسی باتیں۔

جین :۔ لیکن مجھ میں اتنی طاقت نہیں ہے ——— اس کا خیال ہی ——— مجھے خوفزدہ کئے دیتا ہے ———۔ وہ اسٹیج پہ کتنا خوفناک معلوم ہوگا ——— مجھے اس کے ساتھ پارٹ ادا کرنے میں کتنا ——— اُف!

جیک :۔ ارے پگلی! یہ بھی کوئی حقیقت ہے جو ڈر لگتا ہے۔ خیالی انسان ہے۔ اس سے ڈر کیوں معلوم ہوتا ہے ——— خیر میں اس کردار کو ادا کروں گا۔ تب تو تمہیں ڈر نہیں لگے گا؟

جین :۔ نہ ——— نہ نہیں! ——— بشرطیکہ تم اس کو ذرا نرمی سے ادا کرو ——— مگر اوہ! ——— کتنا وحشیانہ کردار ہے!

جیک :۔ ہاں ہے تو! ——— اچھا آؤ ذرا آخری ایکٹ ایک مرتبہ اور پڑھ لیں۔

(دونوں پڑھتے ہیں)

جیک :۔ ڈیل ووکن کا کردار پیش کر کے واقعی تمہارے والد نے ایک بہت بڑا کام کیا ہے۔ ذرا اس منظر کو خیال کرنا اسٹیج پر کتنا مؤثر اور دردانگیز ثابت ہوگا ——— بچہ خوف زدہ سہما ہوا بھوتوں کی

آمدو رفت والے کمرے میں بیٹھا ہوا ہے۔ اور وہ شکل دہلیز پر سے جھانک رہی ہے! ــــــ اُف! کتنا خوفناک منظر کھینچا ہے۔ جین تمہارے والد کہاں ہیں۔ میں ان کو مبارکباد دینا چاہتا ہوں۔

جین۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس وقت سو رہے ہوں گے۔ کیونکہ وہ کل تمام رات اس کو پورا کرنے میں مشغول رہے۔ اور رات بھر جاگنے کی وجہ سے تمام دن بے چین رہے۔ تم خود جانتے ہو جب وہ کسی ڈرامہ کو ختم کر لیتے ہیں تو ان کی کیا حالت ہو جاتی ہے۔ گویا انھوں نے کسی چیز کو گم کر دیا ہے۔ اور چاروں طرف اس کی تلاش میں پھرتے ہیں۔

[جین کے بولنے کے درمیان اسطون باغ کی طرف سے کمرے میں داخل ہوتا ہے اور پیچھے سے دونوں کو اپنے بازوؤں میں لے لیتا ہے]

اسطون:۔ کیوں جیک کیا ابھی تھیٹر سے چلے آرہے ہو؟ میں باغ میں ٹہل رہا تھا۔ آج کی رات بڑی سہانی ہے۔

جین:۔ (سخت لہجہ میں) ابا جان! آپ کل رات کتنا سوئے تھے؟ آپ نے تو آج مجھ سے جلد ہی سو جانے کا وعدہ کر لیا تھا۔ آپ کو اس وقت بستر میں ہو جانا چاہئے تھا۔ آپ اپنی صحت کا بالکل خیال نہیں کرتے۔

اسطون:۔ واقعی تم بالکل سچ ہے۔ مجھے وعدہ کرنے پر شرمندہ ہو جانا چاہیے۔ میں گنہگار ہوں۔ لیکن ننھی جین کو مجھے معاف کر دینا چاہئے کیونکہ قصور چاند کا ہے۔ چاند میرے اس قصور کا ذمہ دار ہے۔ وہ تم سے میری بریت کیلئے بہت کچھ کہہ سکیگا۔ اچھا! تو تم لوگ ڈرامہ پڑھ رہے ہو ــــ تو جیوری کا فیصلہ کیا رہا جیک؟

(وہ آرام کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

جیک:۔ (جوشیلے لہجہ میں) تعجب خیز ہے جناب! ــــ آپ نے تو واقعی غضب کر دیا ہے! ــــ یہ ڈرامہ واقعی ایک بہترین ڈرامہ ہے۔ اور میں بہت شکر گذار ہوں کہ ڈیل ڈولن کے اہم کردار کے لئے آپ نے مجھ خادم کو منتخب کیا۔ یہ کردار واقعی مجھے صفِ اول کے ایکٹروں میں لا کر کھڑا کر دے گا ــــ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایسا سنہرا موقعہ میرے ہاتھ آجائے گا۔

اسطون:۔ (پیار بھرے لہجہ میں) نہیں۔ یہ انگرام کا کام ہے۔ اس نے پہلے چند ایکٹ ہی پڑھ کر

اس ڈرامہ کے حقوق مجھ سے خرید لئے تھے جین اس میں ضروری طور پر کام کرے گی۔ کیونکہ اس کا انگرام کے ساتھ ایک سال کا ٹھیکہ ہے اور جب میں نے ڈولن کے کردار کیلئے تمہارا نام پیش کیا تھا تو وہ فوراً راضی ہو گیا

—— ڈرامہ کچھ خوفناک ضرور ہے۔ تمہارا آخری ایکیٹ کے متعلق کیا خیال ہے ؟

جیک :۔ خدا کی قسم تعریف نہیں کرسکتا۔ اور پھر اس کی طرز نگارش تو کہنا ہی کیا ہے۔ —— یہ آدب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے ۔

جین :۔ (چیں بہ جبیں ہو کر) اچھا جیک ادھر سنو۔ میں اب تمہیں ان کی زیادہ جھوٹی تعریف نہ کرنے دونگی۔ یہ ایک سادہ لوح بوڑھے شخص ہیں۔ ان کا کام سوائے اس کے کچھ اور نہیں ہے کہ ایک مکڑی کی طرح بیٹھے ہوئے پلاٹ کا جالا بنا کرتے ہیں۔ اور اپنے "کرداروں" کو دھوکے سے گرفتار کرنے کی سعی کرتے ہیں —— میرے خیال میں تو ایک بیوقوفی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس مرض کا شکار میں نہ ہوئی۔

سطون :۔ ہم میں سے ہر ایک مریض ہے۔ اور کسی نہ کسی کو کوئی نہ کوئی سا "مرض" لاحق ہے۔ مجھے لکھنے کا مرض ہے۔ تو تمہیں ایکٹ کرنے کا مرض ہے۔ تم بھی مرض سے بچی ہوئی نہیں ہو۔ اپنی زندگی میں کوئی نہ کوئی خواہش انسان کو ہونا ہی چاہئے —— ورنہ وہ انسان کہلانیکا مستحق ہی نہیں ہوسکتا۔

جین :۔ (منہ بنا کر) جی ہاں! بجا ارشاد ہے! اور یہ منطق ہماری سمجھ سے باہر ہے۔

جیک :۔ (ہنسی کو چھپاتے ہوئے) جناب آپ نے ڈرامے لکھنا کیوں شروع کئے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آپ کا پہلا ڈرامہ دس سال پہلے اسٹیج کیا گیا تھا۔ آپ کو اور ادبی راہوں میں سے صرف ڈرامہ نویسی ہی کیوں پسند آئی ۔؟

سطون ۔ مجھے خیال نہیں ہے —— البتہ شاید اسکی یہ وجہ ہو کہ مجھے ایکٹ کرنے سے بہت رغبت تھی۔

جیک :۔ یہ بہت دلچسپ بات ہے۔ مجھے پہلے یہ معلوم نہ تھا کہ آپ کو بھی ایکٹ کرنیکا شوق رہا ہے۔

سطون :۔ ہاں —— اور میں ہمیشہ اس بات کے خواب دیکھا کرتا تھا کہ میں ایک لانبا اور خوبصورت شخص ہوں۔ ہر شخص میرا کہنا مانتا ہے۔ اور عزت کرتا ہے —— لیکن افسوس کہ میرے خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوئے۔ اور میرے قدو قامت نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ اور پانچ فٹ چھ انچ سے زیادہ کبھی میرا قد ہوا ہی نہیں۔ حکومت کرنے کے ہوائی قلعے بھی مسمار ہو گئے۔ اور اب

تم خود دیکھتے ہو کہ میری خود کی بیٹی کس طرح مجھ پر حکم چلاتی ہے ـــــ یہ کہتے ہوئے مجھے کوئی ڈر نہیں کہ میں اپنے خیالوں کا بالکل الٹا ہوں۔ اور اسم بے مسمیٰ ہوں ـــــ تعجب خیز باتیں ہیں یہ بھی!۔ ہم لوگ بھی کیا ہیں! ہم وہ بننا چاہتے ہیں جو دراصل ناممکنات میں سے ہوتا ہے!

جلین :۔ میں سمجھتی ہوں۔ میں جانتی ہوں۔ میں نے اب تک جتنے پارٹ ادا کئے ہیں وہ بہت عمدہ، شریف اور متحمل کرداروں کے تھے۔ اور اگر انصاف کی آنکھ سے دیکھا جائے تو میں نے ان کو بڑی عمدگی سے ادا بھی کیا ہے ـــــ لیکن میری سب سے بڑی آرزو ہے کہ میں ایک "عماری" کا پارٹ ادا کروں۔

جیک :۔ ہاہاہا۔ تم اور حماری کا پارٹ! کتنی مزاحیہ بات ہے! لیکن کوئی کیا کر سکتا ہے نظرایں اپنی پسند اپنی اپنی ـــــ میں نے سوائے "کیرکٹر رول" کے کوئی اور کام نہیں کیا۔ لیکن "نوجوان ہیرو" بننے کی مجھے بھی آرزو رہی ـــــ یہ مثال بالکل ایسی ہی ہے جس طرح کہ ایک مزاحیہ اداکار کو "رومیو" کا پارٹ ادا کرنے کی خواہش ہو یا ایک حسین دوشیزہ جس کا چہرہ مجسم مسکراہٹ ہو "گراؤنڈ ٹریجڈی" میں پارٹ کرنے کی آرزومند ہو!۔

اسطون :۔ اچھا۔ اب یاد آیا۔ اسی قسم کی چیزوں نے مجھے ڈرامہ نگاری کی طرف مائل کیا ـــــ ایک ادیبہ نے جو کہ میری دوست تھی ایک مرتبہ مجھ سے کہا۔

"میں نے ڈرامے لکھنا اس لئے شروع کر دئے کہ اب میرے سب بچے بڑے ہو گئے ہیں۔ انھیں اب میری ضرورت نہیں رہی ہے۔ اب مجھے یہ بتانا نہیں پڑتا کہ وہ کیا پہنیں۔ کب نہائیں۔ بال کس طرح بنائیں یا کھائیں اور درحقیقت انھیں اب میری ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اب مجھے ان کے اچھے کام انجام دینے پر انھیں شاباشی اور برے کام کرنے پر سزا نہیں دینی پڑتی ـــــ وہ میرے کھیل کی چیزیں تھیں جن سے میں کھیل چکی اور اب چونکہ میری گڑیاں مجھ سے چھین لی گئیں ہیں۔ میں دوسری گڑیاں تخلیق کرنے کی طرف منہمک ہو گئی ہوں۔ جو میرے لئے ایک کٹھ پتلی کی مانند ہوں گی۔ جو میں حکم دوں گی انھیں کرنا ہوگا۔ جب میں کہوں گی "آؤ" وہ فوراً حاضر ہو جائیں گی۔ اور جب میں ان سے کھیلتے کھیلتے تھک جاؤں گی تو اپنے آخری الفاظ لکھ دوں گی۔ اور "پردہ گرا دوں گی"

جلین :۔ کیسا عمدہ خیال ہے! ـــــ

اسطون :۔ ہاں ۔ اور میرا خیال ہے کہ یہ معاملہ مجھ سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے ۔ کچلی ہوئی اُمید نے مجھے ڈرامہ نگاری پر مجبور کیا ۔ اگر میں ہیرو کا پارٹ نہیں کر سکتا تو میں ہیرو کو حکم دے سکتا ہوں ۔ میں اُسے اپنی خوشی کے مطابق چلنے پر مجبور کر سکتا ہوں ——— اچھا ابھی مجھے "پردہ لکھنا ہے اور اپنی نئی "کٹھ پتلی" کو خدا حافظ کہنا ہے ۔ اس لئے میری رائے ہے کہ ہم پہلے اس کی صحت کا ایک ایک جام پی لیں ۔

[جین اٹھتی ہے ۔ اور میز پر سے شراب اٹھا کر سب کو دیتی ہے ——— تینوں اپنے جام اونچے کرتے ہیں]

اسطون :۔ ڈیل ڈولن ! ——— جیک ! میرے بچے ! میں جام صحت کے ساتھ تمہیں اس کا پارٹ ادا کرنے میں کامیابی کی دعا کرتا ہوں !

جیک :۔ ڈیل ڈولن ! ——— اس کی صحت کا جام ! ——— اس اُمید میں نوش کرتا ہوں کہ اس کے کردار کو اچھی طرح سے ادا کر سکوں !

جین :۔ (مرتعش آواز میں) ڈیل ! ——— [ایک خوفناک چیخ کیسا تھ وہ اپنا گلاس گرا دیتی ہے اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیتی ہے] ——— اوہ ! نہیں ! نہیں ! میں نہیں کہہ سکتی !

جیک :۔ کیوں جین ! اچھی جین ! بتاؤ تو کیا ہو گیا ؟

جین :۔ میں نہیں جانتی ——— میں نہیں جانتی ۔ مجھے اس سے ڈر لگتا ہے ۔ وہ بہت وحشی ہے ——— میرے اس ڈر پر تم بہت ہنسو گے ——— لیکن مجھے اس سے ڈر لگتا ہے ۔ میں اس کی صحت کا جام نہیں پی سکتی !

اسطون :۔ پگلی ہی رہی ——— ابھی تک کیا بچپن کا ننھا اور معصوم دل مضبوط نہیں ہوا ——— ارے وہ تو کاغذ پہ ہے ۔ اسکی اصلیت اور حقیقت ہی کیا ہے ۔ وہ تو صرف تخیل کی پرواز تک محدود ہے ——— اور تم اس سے سچ مچ ڈرنے لگی ہو ——— خیر اب تم زیادہ تھک گئی ہو ۔ رات بھی زیادہ جا چکی ہے ۔ مجھے بھی تھکاوٹ محسوس ہو رہی ہے ۔ اور تم جیک ؟ تم بھی تھکے ہوئے ہو ۔ اب میں تو جاتا ہوں ۔ اور جیک تم بھی جاؤ ۔ کیونکہ میری لاڈلی بیٹی اب سوئے گی ۔ ——— شب بخیر !

جیک :۔ شب بخیر جناب ! واقعی اب کافی رات گذر چکی ہے ۔ اور میں یہاں بہت دیر ٹھہرا ——— کل رات حاضر ہوں گا ۔ تاکہ اس ڈرامہ کے متعلق تفصیلی گفتگو کر سکوں ——— جین کیا تم مجھے کوٹ پہننے میں مدد دے سکو گی ؟

[وہ دونوں باہر چلے جاتے ہیں۔ اسطون ڈیسک کی طرف بڑھتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں کاغذات ہیں۔ وہاں کھڑے ہوکر وہ ادھر ادھر سے صفحات پڑھتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ قلم اٹھاتا ہے۔ اور آخری صفحہ کے آخر میں "پردہ" لکھ دیتا ہے ۔۔۔ وہ پھر قالین کی طرف جاتا ہے۔ اور نیچے بیٹھ کر اپنی آنکھیں جھکے ہوئے انداز میں بند کرلیتا ہے ۔۔۔ یکایک ڈیسک کے پیچھے سے ایک شکل آہستہ آہستہ ظاہر ہوتی ہے۔ اس کا چہرہ بہت کربہہ ہے۔ اور موت کی مانند سفید ہے۔ آنکھیں بند ہیں۔ ہونٹ بہت سرخ ہیں ۔۔۔ ایک کاندھے پر تھوڑا سا کوبڑ ہے۔ اور اسکی تمام حرکات آٹو میٹک مشین کی مانند اکڑی ہوئی ہیں ۔۔۔ اسطون آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھولتا ہے اور اسے دیکھتا ہے۔]

اسطون:۔ کیوں؟ ۔۔۔ کیوں؟ ۔۔۔ تمہارا مطلب؟ ۔۔۔ تم کون ہو؟ ۔۔۔ تمہیں کس نے اندر آنے دیا؟ ۔۔۔ یہاں میری تنہائی میں تم دخل دینے والے کون؟ ۔۔۔ اس وقت میرے پاس بغیر اجازت آنیوالے تم کون ہو؟

ڈولن:۔ آقا ۔۔۔ تم ۔۔۔ جانتے ۔۔۔ ہو ۔۔۔ میں ۔۔۔ کون ہوں۔

(وہ اپنی آنکھیں کھولتا ہے)

اسطون:۔ کیسی باتیں کر رہے ہو؟ ۔۔۔ ڈیسک سے ہٹ کر کھڑے ہو ۔۔۔ تم کون ہو؟

ڈولن:۔ آقا میری بات سنو۔ میں سب کچھ بتلا دوں گا۔

اسطون:۔ تمہارا کیا مطلب ہے؟ کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟

ڈولن:۔ میں ۔۔۔ ڈولن ۔۔۔ ہوں!

اسطون:۔ ڈولن؟ ۔۔۔ میں نہیں سمجھا ۔۔۔ تمہیں اندر کس نے آنے دیا؟

ڈولن:۔ آقا ۔۔۔ تم نے مجھے اندر آنے دیا ۔۔۔ میں ڈولن ہوں۔

اسطون:۔ (غصّہ میں) سمجھا ۔۔۔ کوئی شخص چھپا ہوا میرے ڈرامہ کو پڑھ رہا تھا۔ اور تمہیں میرے ڈرامہ کے کردار کے مانند بنا دیا ہے ۔۔۔ کس نے تمہیں اس جعلسازی پر مجبور کیا؟ ۔۔۔ کس نے میرے ڈرامہ کو پڑھا ہے؟ ۔۔۔ بتلاؤ؟ ۔۔۔ میں اسے برداشت نہیں کرسکتا۔ میرا ڈرامہ ایک راز تھا۔ سوائے انگرآم کے اس کی بابت کسی اور کو خبر بھی نہیں ہے۔ اور مجھے اس پر پورا بھروسہ ہے کہ اس نے ابھی اس کو کسی پر افشاء نہیں کیا ہوگا۔ اور میری بیٹی اور ہونیوالے داماد نے صرف آخری ایکٹ پڑھا ہے۔

— جواب دو! بُت کی مانند کیا کھڑے ہو؟ — اس خیال میں مت رہنا کہ اپنے میک اَپ سے تم دھوکے میں مبتلا کر دوگے — یہ پہلے ہی سے طے ہو چکا ہے کہ اس کردار کو کون ادا کریگا۔

ڈولن:۔ آقا۔ وہ میں ہی ہوں گا — ہاں وہ پارٹ میں ہی ادا کروں گا۔

اسطون:۔ کیا بک رہے ہو! — تم اس پارٹ کو ادا نہیں کروگے — میرا خیال ہے کہ تم پاگل ہو گئے ہو۔ اور اگر تم یہاں سے فوراً رفوچکر نہ ہوئے تو مجھے ڈر ہے کہ مجھے کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا — سمجھے؟

ڈولن:۔ آقا مجھے کوئی نہیں نکال سکتا — تم بھی نہیں!

اسطون:۔ تم جانتے ہو یا نہیں؟ — یا پھر اپنے نوکر کے ذریعہ کسی کانسٹبل کو بلوا کر تمہیں مداخلت بیجا کے الزام میں گرفتار کرا دوں؟

ڈولن:۔ ٹھہرئیے۔ آقا۔ آپ کے علاوہ اور کوئی بھی جانتا ہے کہ آپ کے ڈرامہ کے آخری ایکٹ کا انجام کیا ہے؟

اسطون:۔ صرف میری بیٹی اور جیک رانڈیل۔ کل رات میرے ختم کرنیکے بعد وہ صرف انہیں دونوں کے ہاتھ میں گیا ہے۔

ڈولن:۔ تو پھر میں ثابت کر دونگا کہ مجھے یہاں ہونے کا حق حاصل ہے — سنئے! آخری سین یہ ہے۔ ڈولن خالی مکان میں واپس آجاتا ہے۔ بچہ جو کہ باغ میں گھوم رہا ہے۔ اُسے دیکھ لیتا ہے۔ ڈولن اسے پکڑ کر بھوتوں کے آمدورفت والے کمرے میں بند کر دیتا ہے۔ تاکہ وہ اس کی آمد کی کسی کو خبر نہ دے سکے۔ اور پردہ بچہ کی ڈراؤنی چیخ و پکاروں کے درمیان گرتا ہے جبکہ خوفناک بھوتوں کے مانند چیزیں دہلیز پر آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں — آقا کیا آخری ایکٹ اسپر ختم نہیں ہوتا؟

اسطون:۔ ہاں — ہاں ہوتا ہے! — مگر خدا کیلئے جلد بتلاؤ یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟

ڈولن:۔ اوہ! — میں اسے جانتا ہوں۔ کیونکہ میں "خود" "ڈولن" ہوں — میں زندہ ہوں۔ میں سانس لیتا ہوں۔ میں حرکت کرتا ہوں۔ دیکھو آقا! جب تم نے صفحہ پر "پردہ" لکھا۔ تو تم نے مجھے زندگی کے روپ میں بلالیا — تم میرے خالق ہو گئے! — دیکھو۔ آقا دیکھو! — میرا منجمد اور اکڑا ہوا عجیب و غریب جسم ہے۔ لیکن میں زندہ ہوں! میں زندہ ہوں!

اسطون :- (سر پکڑ کر) اوخدا ! کیا میرا دماغ خراب ہوگیا ہے ! کیا میں پاگل ہوگیا ہوں ؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ——— یا الہیٰ ! یہ کیا ماجرا ہے ! تمہارا مطلب کیا ہے آخر بھائی ؟ ——— تم تو کاغذ پر صرف ایک خیالی کردار ہو۔ تم زندہ نہیں ہو۔ تمہاری کوئی اصلیت نہیں ہے۔

ڈولن :- لیکن۔ آہا۔ ایسا ہی ہے ——— کاغذ پیکڑوں اور لاکھوں کردار ہوتے ہیں۔ اور وہ کاغذ پر ہی رہتے ہیں۔ کاغذ ہی ان کی پیدائش کی جگہ ہوتی ہے اور کاغذ ہی ان کا مقبرہ۔ ——— لیکن کبھی کبھی کسی کردار کو "حیات بخش چنگاری" مل جاتی ہے۔ جو کہ اس کو زندہ کر دیتی ہے۔ اس میں جان ڈال دیتی ہے ——— مجھے وہ چنگاری مل گئی ہے ! جب تک تم نے "پردہ" نہیں لکھا تھا۔ وہ مجھے نہیں ملی تھی ——— لیکن اب میں حرکت کر سکتا ہوں ! ——— میں زندہ ہوں !

[وہ اکڑی ہوئی چال سے اسطون کی طرف دو تین قدم بڑھتا ہے]

اسطون :- (خوفزدہ لہجہ میں) دور رہو ! دور رہو ! آگے مت بڑھو ! خدا کیلئے پیچھے جاؤ ! ——— میں نہیں جانتا ——— میں نہیں سمجھ سکتا ——— میرا دماغ ماؤف ہو رہا ہے ——— میری طرف نہ آؤ ——— دور ہو !

ڈولن :- ہاں تمہیں ڈر لگنا ہی چاہئے۔ [ڈرامہ کی قلمی تحریر اٹھا لیتا ہے] تم نے مجھے بھی کیا چیز بنایا ہے ——— ایک کمینہ خصلت، لرزہ پیدا کر دینیوالا حیوان سیرت انسان ! ——— ایک ہستی جس کو دیکھ کر ہر ایک دہشت زدہ ہوجائے ! ——— اور اب تم نے مجھے آزاد کر دیا ہے تاکہ میں رات کے وقت انسانوں پر اپنی حکومت چلاؤں۔

اسطون :- میں نے کیا کیا ہے ؟ ——— یہ کبھی نہیں ہو سکتا ——— میں کبھی ایسی خوفناک جسارت نہیں کر سکتا ——— میں نے آخر کیا کیا ہے ؟

ڈولن :- تم نے ایک ایسی چیز کی تخلیق کی ہے جس پر تمہارا خود قابو نہیں ہے ! ——— میں تمہاری طاقت سے دور بہت دور ہو گیا ہوں ——— ایک ہی پھونک میں تم جلتی ہوئی دیا سلائی کو بجھا سکتے ہو ——— لیکن اُسے کسی خشک آتش گیر چیز پر یا کسی جلتے ہوئے جنگل میں پھینک دو اور پھر دیکھو وہی "ننھی دیا سلائی" کیا کرشمے دکھاتی ہے ——— غراتی ہوئی خوفناک آگ جو کہ اس چیز کو نگل جاتی ہے جو کہ اس کے راستہ میں آجائے ——— یہی ہے جو کہ آپ نے کیا ہے ——— میں برباد

کروں گا۔ مسمار کر دوں گا!

اسطون:۔ ڈبل ڈولن اگر یہ معلوم ہے تو تم اپنے اوپر پھر دسرمست رکھو۔ اگر میں نے تمہاری تخلیق کی ہے تو میں ہی تمہارا آقا بھی ہوں۔ تمہارا خالق ہوں۔ تمہیں میرے حکم پر چلنا ہوگا۔

ڈولن:۔ آہا ہا! میرا خیال ہے کہ خدا نے بھی یہی سوچا تھا جب اس نے پہلے پہل دنیا کی تخلیق کی ---- کیا تم نے کبھی سوچا کہ خدائے تعالیٰ کو پشیمانی کے آنسو بہانا پڑیں گے جب وہ اپنی کاریگری پر دوبارہ نظر ڈالے گا؟ ---- کیا تم خیال کرتے ہو کہ دنیا کی تخلیق خدا نے اس لئے کی تھی کہ اسکی تخلیق کی ہوئی "کٹھ پتلیاں" اس کی مرضی کے خلاف کام کریں؟ ---- جھوٹ بولیں، قتل کریں، چوری کریں، اور اس کے نام کی توہین کریں؟ ---- کیا دنیا کو پیدا کرنے سے پہلے اس نے سوچا تھا کہ وہ اپنی مخلوق کو یک دوسرے کے قتل و خون پر آمادہ دیکھے گا اور لاکھوں کو بھوکا مرنا پڑے گا تاکہ دس بارہ عیش کی زندگی گذار سکیں؟ ---- کیا تم خیال کرتے ہو کہ خدا کے کمال کا نمونہ یہی "دنیا" ہوگی؟ ---- اور اگر نہیں تو پھر وہ کیوں اسے بدل نہیں ڈالتا؟ ---- میں تم سے کہوں گا آقا۔ اور ڈنکے کی چوٹ کہوں گا کہ وہ اپنی مخلوق کو قابو میں نہیں رکھ سکتا ---- اور اسی طرح تم بھی مجھ پر قابو نہیں رکھ سکتے! ---- یقین مانو۔ بالکل یہی معاملہ ہے۔

اسطون:۔ یہ سب غلط ہے! ---- میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ میں ضرور خواب دیکھ رہا ہوں ---- یہ سب باتیں بالکل خیالی اور وہمی ہیں ---- لیکن کتنی خوفناک! ---- میں کیا کروں؟ اے خدایا! یہ کیا ہو رہا ہے! ---- (پرجوش لہجہ میں) لیکن میں ڈولن کے کردار کو بدل دوں گا۔ چاہے ایسا کرنے سے میرا ڈرامہ ہی خراب ہو جائے ---- میں بہت پریشان ہوں۔ تھک گیا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ کیا کروں۔ کیا سوچوں اور کون سی راہ اختیار کروں۔

ڈولن:۔ او بیوقوف اور سادہ لوح انسان! ---- اس وقت تم نے کچھ نہیں سوچا جب تمہارے اوپر شیطان سوار ہوا تھا؟ جب تم نے ڈیسک پر بیٹھ کر سادے کاغذ پر قلم کی ایک معمولی جنبش سے ایک "دہشت" کی تخلیق کی؟ ---- ایک ایسی خوفناک ہستی کی شکل میں جو کہ اپنی خواہش کے مطابق انسانوں میں چل سکے۔

اسطون:۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ یہ کبھی صحیح نہیں ہو سکتا۔

ڈولن:۔ یہ صحیح ہے ـــــ تمہارا ان جرموں کی بابت کیا خیال ہے جن کے مرتکب بغیر سزا کے چھٹتے ہیں؟ ـــــ اور ان ڈراؤنے قتلوں کی بابت تم کیا کہتے ہو۔ جن کا ارتکاب ایسی چیزوں سے ہوتا ہے جن کی تخلیق تم جیسے لوگ کرتے ہیں؟

[وہ ایک قدم آگے بڑھتا ہے]

اسطون:۔ دور ہو! ـــــ آگے مت بڑھو۔ او خدا! ـــــ دور ہو!

ڈولن:۔ اف! ہم تم سے کتنی نفرت کرتے ہیں اور کتنی بد عائیں دیتے ہیں! کیونکہ تمہیں ایسا بنانے ہو جیسا کہ ہیں ـــــ بھدے، بے ڈول جسم، نا پاک روحیں! اپنے خالق سے متنفر! ـــــ ہمیں اپنی "وحشت" سے سخت نفرت ہے۔ ساتھ ہی اس کے "مصنف" سے بھی ـــــ اوہ! (غصّہ میں) ہم سب "کیلیبان" ہیں۔ جن کی نظریں ہمیشہ ستاروں پر لگی رہتی ہیں۔ لیکن وہ ہماری پہونچ سے اتنی دور ہیں کہ مایوسی میں ہم کیچڑ میں گر پڑتے ہیں ـــــ آقا! جو کچھ بھی ہو تم میرے آقا ہو ـــــ تمہارے ڈرامہ میں میں اپنے کردار کو خود ادا کروں گا۔ اور تمہیں بتلا دوں گا کہ میں کتنا فاسد اور وحشی ہوں۔ کیونکہ تم نے مجھے راستہ بتلا دیا ہے۔

(جین داخل ہوتی ہے)

جین:۔ ابّا۔ میں نے تو سمجھا آپ سو رہے ہوں گے ـــــ اگر آپ نہ سوئے تو صبح کچھ بھی نہ کر سکیں گے۔ اور آپ نے تو مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ ـــــ اوہ! مجھے افسوس ہے! میں نے نہیں دیکھا کہ آپ یہاں کسی سے باتیں کر رہے ہیں۔

اسطون:۔ (گھبرائے ہوئے لہجہ میں) ہاں جین میں مشغول ہوں۔ تم اچھی لڑکیوں کی طرح یہاں سے فوراً بھاگ جاؤ۔ میں زیادہ دیر نہیں جاگوں گا ـــــ جاؤ! بھاگ جاؤ!

جین:۔ آپ کتنے عجیب و غریب نظر آ رہے ہیں۔ کیا خدا نخواستہ طبیعت خراب ہے! ـــــ کیا معاملہ ہے ابا جان! آپ مجھے کیوں نہیں بتلاتے۔ ضرور آپ کی طبیعت خراب ہوگئی ہے۔ اب آپ سو جائیے۔

اسطون:۔ نہیں جین۔ میں اچھا ہوں۔ بس تھوڑی تھکاوٹ ہے ـــــ لیکن تم خدا کیلئے مجھے اکیلا چھوڑ دو۔

ڈولن:۔ (آگے بڑھ کر) آقا میرا اس جین سے تعارف کرا دیجئے نا!

[جین گھبرا کر پیچھے ہٹتی ہے]

اسطون:۔ (گھبرا کر) یہ ضروری نہیں ہے —— جین تم سے میں نے کیا کہا؟ —— اپنے باپ کی اتنی سی بات نہ مانوگی؟

ڈولن:۔ یہ بہت ضروری ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے واقف ہو جائیں —— ٹھہریے مس جین! —— میں ڈولن ہوں —— ڈین ڈولن!

جین:۔ (خوفزدہ لہجہ میں) ڈین؟ —— ڈولن؟! —— ابا جان! —— آپ کا ڈرامہ —— میرا خیال تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ جیک اس پارٹ کو میرے ساتھ ادا کریگا ۔ میں ڈرامہ میں جیک کے سوا کسی اور کے ساتھ کام نہیں کر سکتی!

ڈولن:۔ میرا خیال ہے مس جین کہ آپ کو میرے ساتھ تو اس ڈرامے میں کام کرنا ہوگا! —— میں نے ہیرو کے پارٹ کا ٹھیکہ لے لیا ہے ۔ کیوں نا آقا؟ —— میں عاشق ڈولن کا پارٹ بہت اچھی طرح ادا کرونگا ۔ تمہارے جیک سے بھی اچھا۔ تم خود دیکھ لوگی ۔

[وہ آگے بڑھتا ہے]

جین:۔ (خوفزدہ اور گھبرائی ہوئی آواز میں) اوہ ۔ نہیں ۔ نہیں ۔ نہیں ۔ ابا تم کیوں نہیں بولتے ۔ میں کبھی ایسا نہیں کر سکتی ۔ میں سوائے جیک کے اور کسی کے ساتھ یہ پارٹ ادا نہیں کر سکتی ۔ کبھی نہیں مجھے ڈر لگتا ہے

اسطون:۔ (ڈولن سے) پیچھے رہو ۔ آگے نہ بڑھو ۔ سنتے نہیں! —— ابھی جین تم چلی جاؤ ۔ فوراً چلی جاؤ ۔ مجھ سے ایک غلطی ہوگئی ہے —— پھر بتلا دونگا ۔ لیکن تم جاؤ ۔

ڈولن:۔ نہیں ٹھہرو ۔ کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے ۔ اور نہ کچھ سمجھانے کی ضرورت ہے —— میں ڈین ڈولن کا پارٹ ادا کروں گا ۔ اور مس جین "میری کا" —— اور ہم ابھی ریہرسل کریں گے ۔ (وہ لیمپ اٹھا کر میز پر رکھ دیتا ہے) میں یہاں کھڑکی کے پاس کھڑا ہوتا ہوں ۔ یہاں سوائے چاندنی کی روشنی کے اور کوئی روشنی نہیں ہے —— بہت سرد اور ظالم روشنی! —— بقول آقا! —— میں واپس آ گیا ہوں ۔ میں "میری" کو اپنے پاس بلاتا ہوں ۔ میری جو میری زندگی میں مجھ سے نفرت اور سخت نفرت کرتی تھی —— لیکن موت نے مجھے نئی طاقتیں دیدی ہیں —— میں میری کو پکارتا ہوں —— میری! (جین ایک نیند میں چلنے والے شخص کی مانند اس کی جانب بڑھتی ہے —— اسطون خوفزدہ

نظروں سے دیکھتا ہے) میری! ــــ میرے پاس آؤ! ــــ میری! ــــ مجھے تم سے محبت ہے مجھے اپنے سچے محبوب کی طرح پیار کرو! (جین اس کا بوسہ لیتی ہے) کیا تمہیں مجھ سے محبت ہے؟

جین :۔ ہاں! میں تم سے محبت کرتی ہوں!

ڈولن :۔ کیا تم مجھے اپنا آقا، اپنا سرتاج سمجھتی ہو؟

جین :۔ تم میرے آقا ہو!

ڈولن :۔ کیا تم میری فرماں برداری کروگی؟

جین میں تمہاری لونڈی ہوں!

ڈولن :۔ جب میں بلاؤں گا تم آؤ گی؟ ــــ خواہ تم دنیا کے کتنے ہی دور دراز حصے پر ہو جب ہی آؤ گی؟

جین :۔ اگر تم بلاؤگے تو خواہ میں دنیا کے کسی حصے میں بھی ہوئی ضرور آؤں گی!

ڈولن :۔ (اسطون سے) دیکھا آقا تم نے؟ ــــ وہ خود اقرار کر رہی ہیں ــــ وہ میرے ساتھ عاشق کا پارٹ ادا کرنے کو تیار ہیں ــــ اب زیادہ کہنے سننے کی ضرورت نہیں ــــ اچھا مس جین اب تم جاؤ۔ چلی جاؤ!

[جین کمرے سے چلی جاتی ہے]

اسطون :۔ او شیطان! ــــ پاپی! ــــ تو نے اس پر یہ کیا کر دیا ــــ خدا کیلئے بتا تو نے اس پر کیا جادو کر دیا؟ ــــ تو کون ہے؟

ڈولن :۔ تم جانتے ہو میں کون ہوں۔ پھر مجھ سے پوچھتے ہو ــــ میں تمہارے دماغ کی فاسد دھوکا دینے والی۔ وحشی اور بری تحریکات کا مجموعہ ہوں! ــــ تمہاری روح کی گہرائیوں میں جو خیالات پرورش پا رہے ہیں اُن ہی سے میری تخلیق ہوئی ہے!

اسطون :۔ (سسکتے ہوئے) وحشی! ــــ ظالم! بدکار! ــــ لیکن میں جین کو تجھ سے دور رکھوں گا ــــ تو اسے اب کبھی نہ دیکھ سکے گا۔

ڈولن :۔ اف! حسین چڑیا جین! ــــ میں پاک و معصوم جین کو کیچڑ میں گھسیٹ لیجاؤں گا۔ لیکن ــــ لیکن (گھبرائے ہوئے لہجہ میں) میں اس سمیت ستاروں تک کیوں نہیں پہونچ سکتا؟

مجھے جین سے محبت ہوگئی ہے! ـــ تم شیطان ہو! تم ظالم ہو! ـــ تم نے مجھے سور کی مانند زندگی بسر کرنے کیلئے کیچڑ اور زندگی کی غلاظت میں پیدا کیا ہے ـــ حالانکہ تم جانتے تھے کہ مجھ میں ستاروں کی سی خوبصورتی ہے ـــ لعنت ہے تم پر اور پھٹکار ہے تمہارے قلم پر! ـــ لیکن اس کی سزا تم کو اپنی حسین جین کے ذریعہ بھگتنا پڑے گی!

اسطون:۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں نے بیوقوفی کی۔ لیکن تم اپنی باتوں پر یقین نہ کرو۔ اپنی باتوں پر بھروسہ نہ رکھو۔ میرے پاس ایک طریقہ ہے جس کے ذریعہ میں تمہیں ایسا کرنے سے روک سکتا ہوں ـــ صرف مجھے اپنا قلم پھر اٹھانا پڑے گا۔

ڈولن:۔ اچھا میں سمجھا کیا تمہارا خیال ہے کہ تم اپنے ڈولن سے "موت کی توبہ" کے ذریعہ آزاد ہو جاؤ گے؟ کبھی نہیں۔ آقا۔ کبھی نہیں! تخیلات حقیقت ہوتی ہیں حقیقت! ـــ مجھے بیکار تخلیق کیا گیا ہے قصہ ختم ہوا۔ لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ مجھ میں جتنی شیطانیت تم نے اپنے خیال سے رکھی تھی اس سے کچھ زیادہ ہی ہے۔

اسطون:۔ نہیں۔ میں تمہیں ڈرامہ میں "موت کی توبہ" کے ذریعہ نہیں ختم کرنا چاہتا۔ بلکہ ایک بات اس سے بھی اہم ہے ـــ میں نے اس وحشی پن کا ارتکاب انسانیت کے خلاف کیا ہے۔ لہذا میں ہی اس کی سزا بھی بھگتوں گا [وہ قلمی تحریر اٹھاتا ہے] یہ تھا میرا ڈرامہ! اگر میں تمام اپنی بقیہ زندگی بھی صرف کردوں تب بھی اس کے برابر کبھی نہیں لکھ سکتا ـــ لیکن قبل اس کے کہ تم دنیا میں قدم رکھو میں اس کو ضایع کردوں گا۔ میں اس کو پرزے پرزے کر ڈالوں گا۔ اور پھر دیکھونگا کہ تم کہاں ہو اور کیا کر سکتے ہو؟

ڈولن:۔ کیجئے اور نتیجہ دیکھئے!

[اسطون:۔ قلمی تحریر کو پھاڑتا ہے ـــ لیکن ڈولن کھڑا مسکرا رہا ہے]

ڈولن:۔ قلمی تحریر! آقا وہ تو "ماں کا پیٹ" تھا جس سے کہ میں پیدا ہوا ـــ بلکہ میرا "حمل" تمہارے "دماغ" میں تھا ـــ تم میرے خالق ہو۔ جب تک تم زندہ ہو میں رہوں گا ـــ بیس تیس یا چالیس چاہے کتنے ہی سال ہوں ـــ میں دنیا میں آزاد گھوموں گا ـــ اپنے پاؤں کیچڑ میں گھسیٹتا ہوا ـــ چاہے کبھی کبھی ستاروں کی طر

بھی نظر کر لوں ——— لیکن میری موت کا دار و مدار تم پر ہے ۔

اسطون :۔ (تیزی سے دروازہ کھول کر ریوالور نکالتا ہے ۔) اچھا ——— اگر تم انسان ہو اور تم میں جان ہے تو میں تمہیں قتل کر دوں گا ۔ قبل اس کے کہ تم میری جبین کو اپنے گندے غلیظ ہاتھ اور ہونٹ لگا سکو ——— اگر تم جیسا کہ کہتے ہو در اصل وہی ہو جس کی کہ تخلیق میری بدکاری نے کی ہے تو میں جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے ۔

[وہ فائر کرتا ہے ——— لیکن ڈولن پر اثر نہیں ہوتا]

ڈولن :۔ آقا ۔ کیوں بیکار کوشش کرتے ہو ——— میں تمہاری روح کا ایک حصّہ ہوں ——— تمہاری زندگی کا حصہ دار ! ——— میری زندگی تم پر منحصر ہے ۔ اور تمہاری زندگی میں مجھے کبھی بھی کوئی نہیں مٹا سکتا ۔

اسطون :۔ اگر ایسا ہے تو پھر تم نے مجھے بتلا دیا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے ——— میں نے غلطی کی ہے میں مجرم ہوں ۔ اس لئے سزا کا مستحق بھی میں ہی ہوں ۔ اگر میری موت سے وہ بدکار چیز مٹ سکتی ہے جسے کہ میں نے تخلیق کیا ہے تو میں ایسا ضرور کروں گا ——— (آہستہ آہستہ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں) اوخدا ! ——— میرے گناہ معاف کر دے ۔ میں نے جو کچھ کیا ہے اس پر میں شرمندہ ہوں ——— میں ان تخیلات پر پشیمان ہوں ——— اے خدا !

[وہ ریوالور اپنے سینہ پر رکھ کر فائر کر دیتا ہے ——— ڈولن آہستہ آہستہ اکڑی ہوئی چال سے ڈیسک کے پیچھے پہونچ جاتا ہے ۔ اور جوں ہی اسطون کرتا ہے ڈولن آنکھیں بند کر کے آہستہ آہستہ نظروں سے غائب ہو جاتا ہے ۔]

(پردہ)

(لال نورس)

(شہاب سلیمانی)

رقص کا جنازہ

کل سرِ رَہ اک آدمی تضحیک کے بہروپ میں
رقص کرتا جا رہا تھا چلچلاتی دھوپ میں

ناچتا جاتا تھا لیکن دل میں اس کے درد تھا
مضحکہ انگیز تھی پوشاک، چہرہ زرد تھا

دل کے داغوں کی لپٹ سے گرم تھی اسکی جبیں
ہم نے ایسا ناچنے والا کبھی دیکھا نہیں!

گونجتی تھی ڈھول کی اس طرح سے خونی گمک
رزم گاہوں کی فضا میں جیسے توپوں کی دھمک

کھِل رہا تھا عارضوں میں اس طرح رنگِ شباب
مقبرے میں جس طرح عکسِ غروبِ آفتاب

غم زدہ چہرے پہ تھے غازے کے یوں نقش و نگار
جیسے مرجھائے ہوئے غنچے پہ شبنم کا نکھار

گھومتی تھیں اس طرح آنکھوں میں اس کی پتلیاں
خون کے دریا میں جیسے تیرتی ہوں مچھلیاں

کانپتا تھا گھنگروؤں کی لے کا خونی زیر و بم
جیسے کوئی گرم انگاروں پہ رکھتا ہو قدم

پڑ گئی تھیں اس طرح چہرے پہ اسکے جھریاں
جیسے پتھریلی چٹانوں میں بنی ہوں سیڑھیاں

مادرِ بھارت کی سر پہ اب نکہت گیسو تھا وہ
قوم کی آنکھوں کا اک ٹپکا ہوا آنسو تھا وہ

تھا وہ اک چھالا، بہ بانِ ارضِ تشنہ کام کا
ایک گہرا زخم تھا وہ سینۂ ایام کا

کر چکا جب رقص تو میں نے کہا اس سے سوال
سچ بتا کس بات کا ہے تجھ کو اس درجہ ملال

اپنی نظروں کو جھکا کر اس نے مجھ سے یوں کہا
کیا کرو گے سن کے میری زندگی کا ماجرا

زیست کی یہ ہولناکیوں میں اجالا ہی نہیں
بیکسوں کی بات کوئی سننے والا ہی نہیں

تم سمجھتے ہو جسے یہ ڈھولکی کا ساز ہے
میرے دل کے ٹوٹنے کی گمشدہ آواز ہے

ہاں مرے دکھتے ہوئے دل نے سکوں پایا نہیں
صبح سے تا شام ہم نے آج کچھ کھایا نہیں

موت کی چیخیں ملا کر زندگی کے راگ میں
اس لئے پھاندے ہیں ذلت کی دہکتی آگ میں

دشمنِ انسانیت تضحیکِ دنیا بن گئے
بھوک نے عاجز کیا تو ہم تماشا بن گئے

یہ کہا اور جذبۂ گریہ کو دل میں داب کر
چل دیا وہ کانپتے ہونٹوں کو اپنے چاپ کر

آنکھ کے ساغر میں اشکوں کے شرارے سو گئے
سینۂ گرداب میں گنگا کے دھارے سو گئے

دل کی بجلی غم کے بادل میں تڑپ کر کھو گئی
روح کے آتشکدے کی آگ ٹھنڈی ہو گئی

پارہ پارہ قلب ہندوستان کی کوئی قاش تھا
درحقیقت رقص کی وہ ایک زندہ لاش تھا

لیلئ ظلمات بدرخشندگی کے بھیس میں
موت کی خونخوار دیوی زندگی کے بھیس میں

تابکے یہ ظلم انسانوں پہ ڈھایا جائے گا
کب تلک یہ خوں چکاں خنجر چلایا جائے گا

سروش ملیح آبادی

نئے خریداروں سے

اضطراب کے نئے خریدار لکھنؤ کے پتے کی رسیدیں بیکار سمجھیں
بنارس کے پتے کی رسیدیں قبول فرمائیں۔ رسیدوں کی پشت
پر "منیجر اضطراب" بنارس کی مہر ہوگی۔ اور رسید سید محمد عمر صاحب
رضوی گونڈوی کے دستخط ہوں گے۔

"منیجر"

پاگل

(۱)

اُس مٹی اور پھوس کے بنے ہوئے مکان میں جب سے اس نے رہنا شروع کیا تو اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ دکھ اور مصیبت کی دنیا سے نکل کر خوشی اور مسرت کی دنیا میں بس گئی ہے۔ جہاں وہ ہے اور اس کا شوہر۔ بس صرف یہی دو ہستیاں اور ان کا کچا مکان ان کے لئے نمونۂ جنت تھا۔ ان کھیتوں میں جہاں اس کا شوہر ڈھلتے ہوئے آفتاب کی سرخ کرنوں کے تلے اپنے جسم کا وہ دلچسپ پسینہ موتیوں کے مانند بہا کرتا، وہ لہلہا دیتے کہ جن پر انسان کی زندگی کا دارومدار ہے۔ صبح سے شام تک سخت محنت کے بعد شمبھو اپنے کندھے پر ہل رکھے ہوئے مکان کی طرف لوٹتا تب آفتاب میں کوئی اپنی سنہری کرنوں کا آخری دامن سمیٹ رہا ہوتا۔ دلاری آنگن میں بیٹھی شمبھو کا انتظار کر رہی ہوتی۔ جیسے ہی شمبھو کے پیروں کی آہٹ ہوتی وہ اٹھ کر کھڑی ہو جاتی خوشی سے اس کے ہونٹ ہلنے لگتے۔ شمبھو ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھانے بیٹھتا۔ تو دلاری پوچھتی۔

”تم اتنی سخت محنت نہ کیا کرو؟ مجھے اندیشہ رہے کہ کہیں کوئی تکلیف نہ ہو جائے“۔ اس پر شمبھو جواب دیتا۔

”اگر اتنی محنت نہ کروں گا تو تمہارے لئے چاندی کی ہنسلی کس طرح لاؤں گا اور جھمکے کس طرح تیار ہوں گے؟“ دلاری کے گالوں پر ایک ہلکی سی سرخی دوڑ جاتی اور پھر وہ نہ بولتی۔ اس لئے کہ زیور عورت کی سب سے زیادہ عزیز چیز ہے۔

کھانا کھا کر شمبھو کچھ دیر کھیتوں میں ٹہلتا۔ وہاں سے واپس آ کر سونے چلا جاتا جہاں حسین خواب اس کے دماغ میں چکر لگاتے۔ جہاں اُسے محسوس ہوتا کہ وہ یکایک راجا ہو گیا ہے جس کے چاروں طرف پریاں ناچ رہی ہیں۔ اس کے بغل میں دلاری رانی بنی بیٹھی ہے۔ اور اس خوشی اور مسرت کے لمحے میں جب وہ زمین کی اتھاہ گہرائیوں سے اُٹھ کر فلک کی نامعلوم بلندیوں میں پرواز کرنے لگتا۔ نیند اُسے اپنی آغوش میں لے لیتی۔

اور اسی طرح جب یہ دو ہستیاں ہنسی خوشی اپنی زندگی گذار رہی تھیں ایک تیسری ہستی نمودار ہوئی۔ جس نے اس کے حسین خواب کے ٹکڑے کر دئے۔ جس نے اس کی پاک محبت میں حسد کے بیج بوئے۔ اور جس نے دونوں کو ہمیشہ کیلئے جدا کر دیا۔

رامو شمبھو کا دوست تھا۔ دونوں ایک ہی گاؤں میں رہتے تھے ایک ہی ساتھ کام کرتے اور ایک ہی ساتھ بچپن میں کھیلنے کودنے تھے۔ ادھر چند سال سے رامو شہر بھاگ گیا تھا جہاں اس نے اپنی محنت و مشقت کی وجہ سے بہت کچھ کمایا۔ جب وہ سفید سفید کپڑے اور انگریزی کوٹ پہن کر گاؤں لوٹا تو شمبھو نے اس پر کچھ زیادہ تعجب ہی نہیں کیا بلکہ اس کے دل میں شہر جاکر دولت کمانے کی آرزو بھر گئی۔

دونوں بہت محبت سے ملے۔ دونوں نے اپنی زندگی کے گذرے ہوئے حالات ایک دوسرے کو سنائے۔ رامو ایک بھاوج ملنے پہ بہت خوش ہوا۔ دوسرے دن صبح کے دھندے میں جب شمبھو کندھے پر ہل رکھے کھیت کی جانب چلا تب رامو نے اس پر تعجب ظاہر کرتے ہوئے کہا" اتنی محنت اگر تم شہر میں کیا کرتے تو ایک دن دولت مند ہو جاتے۔

اتنا سنکر شمبھو زمین پہ ہل رکھ کر رامو کے سامنے بیٹھ گیا۔

کیا تم سچ کہتے ہو رامو!۔ شمبھو تعجب سے بولا۔

رامو بولا۔ ہاں شمبھو اگر تم اس دفعہ میرے ساتھ چلو تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم ضرور دولت مند ہو جاؤ گے"

شمبھو نے خوشی سے اس کی رائے مان لی۔ اور یہ بات طے ہو گئی کہ اس مرتبہ جب وہ شہر جائیگا تو شمبھو بھی اس کے ساتھ چلے گا۔

اس دن شام کو جب شمبھو نے کھانا کھاتے وقت دلاری سے اپنے پردیس جانے کے ارادے کا ذکر کیا تو دلاری کے دل پہ سانپ لوٹ گیا اسکی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے اور اس نے روتے ہوئے کہا۔

"لیکن میرا کیا ہوگا؟ کیا مجھے بھی اپنے ساتھ نہ لے چلو گے"

"وہ پردیس ہے دلاری۔ وہاں نہ مجھے کوئی جانتا ہے اور نہ پہچانتا ہے۔ میں تمہیں لئے ہوئے

کہاں کہاں پھروں گا جب کہیں نوکری لگ جائے گی تو تمہیں بھی اپنے ساتھ لے چلوں گا۔" شمبھو نے
دلاری کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

(۳)

تین سال گذر گئے۔ دُلاری راہ دیکھتی ہی رہی مگر نہ آیا من کا میت۔ شمبھو نے جاتے ہوئے
کہا تھا کہ وہ وہاں پہنچتے ہی خط بھیجے گا۔ لیکن آج تک ایک بھی خط نہ آیا۔ دُلاری روزانہ ڈاکئے
سے خط کے بارے میں پوچھتی۔ لیکن ڈاکئے کی ایک نہیں میں اس کی ساری امیدیں خاک میں مل
جاتیں۔ یہ تین سال اس نے کس طرح گذارے تھے اسی کو معلوم تھا۔ اپنے گہنے اور گھر گرہستی بیچ کر
اتنے عرصے اس نے کس طرح پیٹ پالا تھا۔ اب کس طرح گذر ہو؟ یہ سوال اس کے دماغ کو گھن کی
طرح کھائے جا رہا تھا۔ آخر وہ دن بھی آ پہنچا جب اُسے سارا دن بھوکا رہنا پڑا۔ اس نے سوچا
کیوں نہ زمیندار کے کھیتوں کی کٹائی میں شامل ہو جائے۔ جو کچھ وہاں مل جائے گا وہی کچھ دنوں
کیلئے کافی ہوگا۔ شاید شمبھو اس وقت تک کچھ روپئے وغیرہ بھیجے یا خود ہی آجائے۔
اور دُلاری کے پاؤں ان کھیتوں کی جانب اُٹھے جن میں اس نے کبھی کام نہ کیا تھا۔ جو
اس کے لئے بالکل اجنبی تھے۔ کس طرح پودے کاٹے جاتے ہیں یہ وہ نہیں جانتی تھی۔ اس کے ہاتھ
میں ہنسیا تھا۔ وہ کھیت میں بیٹھ گئی اور پودے کاٹنے لگی۔
وہ رات بھر خوب روئی تھی۔ اس کی آنکھیں سُرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔ چلچلاتی دھوپ
تھی پھر بھی اس کے ہاتھ مشین کے پرزوں کی مانند چلتے رہے۔
راگھو نے اُسے دیکھا۔ وہ پاس ہی کھڑا کھیت کاٹ رہا تھا۔ اس کا تمتماتا ہوا چہرہ دیکھ
کر اُسے کچھ خوف معلوم ہوا۔ اس نے دُلاری سے پوچھا۔
"ارے تیرا چہرہ تو لال سا ہو رہا ہے۔ کیا بات ہے؟ بُکھار تو نہیں ہے؟"
"ہاں کچھ طبیعت ٹھیک نہیں ہے" اس نے اٹکتی ہوئی زبان سے کہا۔"
"جاکر بیٹھ! نیم کے سایہ میں نہیں تو بُکھار چڑھ جائے گا۔"
مگر وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹی۔ راگھو سے نہ رہا گیا۔ اُس نے جھٹ دُلاری کو ہاتھوں میں
اٹھا اس کے گھر پہنچایا۔ اور دوڑ کر ویدجی کو بلا لایا۔ وید کی دوا سے اب دلاری بالکل تندرست

ہوگئی۔ راگھو اور دلاری ایک ہی گھر میں بھائی بہن کی طرح رہنے لگے اور شمبھو کا انتظار کرنے لگے۔

× × × × × × × × × × × × × ×

پاپی سماج کو راگھو اور دلاری کی پاکیزگی کا بالکل یقین نہ آیا۔ وہ لوگ طرح طرح کی بد گمانیاں کرنے لگے تھے۔ لیکن انھیں یہ کون سمجھاتا کہ وہ بھائی بہن ہیں۔

(۴)

ایک دن شمبھو سر پہ پگڑی رکھے اور جسم پر انگریزی کوٹ ڈاٹے نمودار ہوا۔ سامنے سے گاؤں کا چمار آرہا تھا۔ اس کو دیکھ کر اس کا کلیجہ کانپ گیا۔ لیکن اس نے چمار سے باقاعدہ رام رام کیا۔ اور اس سے گاؤں کا کچھ حال دریافت کرنا چاہا۔

چمار بولا۔ "کیا کہیں بابوجی! ان نوجوانوں کے مارے ناک میں دم ہے۔ کسی کی لاج بگاڑنے میں ان کو ڈر نہیں۔

شمبھو کا کلیجہ ہل گیا۔ ایک نہ معلوم خوف تیر بن کر اس کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں پیوست ہوتا معلوم ہوا۔

"آخر بولو تو چودھری کیا واقعہ ہوا" اس کی زبان اٹک رہی تھی۔

" ارے وہی دلاری۔ ادھر کچھ دنوں سے خوب گل چھرے اُڑا رہی ہے۔ بھلا ہم لوگوں کو معلوم ہی کیسے ہوتا۔ وہ تو ایک ہی مکان میں رہنے لگی۔ تب لوگوں کو شبہہ ہوا۔ آپ جانتے ہیں نہ راگھو کو وہی "چھٹا ہوا بدمعاش"

اس کے آگے شمبھو اور کچھ نہ سن سکا۔ اس کا چہرہ غصّہ سے بالکل سرخ ہو رہا تھا۔ اس کا دل اس دنیا کی ناپاکی اور بے عصمتی پر بغاوت کر رہا تھا۔ اب وہ ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑے گا۔ دونوں کو قتل کرے گا۔ اس کے دماغ میں یہ خیالات بجلی کی مانند کوند گئے۔

(۵)

قریب قریب نصف شب گذر چکی تھی۔ ساری دنیا نیند کی آغوش میں مردے کے مانند اپنے اپنے بستروں پر لیٹی ہوئی تھی۔ صرف وہ جاگ رہا تھا۔ وہ اس مکان کے چاروں طرف چکر کاٹ رہا تھا جس میں اب دلاری اور راگھو رہتے تھے۔ اس کا دل خوف اور غصّہ سے کانپ رہا تھا۔ آخر

وہ اس مکان کی تاریکی میں جہاں راگھو اور دلاری دونوں سو رہے تھے دروازوں کو ڈھکیل کر گھسا۔ اس کا ہاتھ اس کے کمر میں بندھے ہوئے خنجر پر گیا اور ایک ہی لمحے میں اسکی تاریکی میں ایک خوفناک چمک پیدا ہوئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور شمبھو کے ہاتھ خون آلودہ ہو گئے۔

اور وہ شمبھو جو اس قدر سیدھا تھا کہ کسی سے بدزبانی کرنا بھی گناہ سمجھتا تھا۔ اب دو ہستیوں کا خونی بن کر ہوا کے پروں پر چڑھ کر اس کہنہ مشق طیارے کے مانند فلک میں پرواز کرتا ہوا اس جگہ نکل گیا جہاں اس کا کوئی دوست نہ تھا۔ جہاں وہ سب کے لئے اجنبی تھا۔ دو دو خون کر کے کون آدمی اپنا دماغ ٹھیک رکھ سکتا ہے اور جب کہ اُسے ایک زبردست صدمے کو برداشت کرنا پڑے ۔ اب شمبھو بھی پاگل ہے۔

شہر کی ان گندی گلیوں میں جہاں متعدد ہستیاں اپنی گندگی کے ڈھیر جمع کرتی ہیں۔ ایک پاگل گھوما کرتا ہے ۔ وہ کچھ کھویا سا رہتا ہے۔ لڑکے اُسے دیکھ کر تالیاں بجاتے ہیں۔ گھوڑے اُسے دیکھ کر ہنہناتے ہیں۔ مگر کون اُسے سمجھائے کہ دلاری راگھو کی بیوی نہیں بہن تھی۔

(نریندر بہادر سنگھ پولیس لائن بنارس کینٹ)

نوٹ

وی۔ پی کے لئے چار آنے کے ٹکٹ آنے ضروری ہیں، اور نمونے کیلئے دو آنے کے ٹکٹ

"منیجر"

غزل

کیوں دل نہ مضمحل ہو کہ ہوں نکے درد سے دور
یہ ہر نئی تکان یہ ہو گی سفر سے دور

مجھ کو بسا گئے ہیں وہ اپنی نظر سے دور
دنیا بھی میں نے پائی تو شام و سحر سے دور

ہوتا ہے بے سبب بھی کہیں بیقرار دل
آخر وہی ہوا کہ ہوئے تم نظر سے دور

تاریکی نظر نہ ہٹیگی ترے بغیر
وہ رات تھی جو ہو گئی نورِ سحر سے دور

ابتک تمہارے قلب کی سنتا ہوں دھڑکنیں
کتنے قریب ہو کے ہوئے ہو نظر سے دور

تم جتنے فاصلے پہ ہو معلوم ہے مجھے
جتنے قریب دل سے ہو اتنے نظر سے دور

اللہ رکھے بزم تصور کو برقرار
وہ ہم سے دور ہیں نہ ہماری نظر سے دور

جانا ہے ان کے سامنے ہمکو شکستہ حال
پڑئے اُدھر سے پڑتی ہو منزل جدھر سے دور

مدّت گذر گئی انھیں بچھڑے ہوے نذیر
ابتک اداسیاں نہ ہوئیں میرے گھر سے دور

(نذیر بنارسی)

تمہاری یاد

اندھیری رات میں جس وقت تارے مسکراتے ہیں
اندھیرے آسماں پہ اک نیا منظر دکھاتے ہیں
مجھے اسوقت اندازِ محبت یاد آتے ہیں
میں تم کو یاد کرتا ہوں میں تم کو یاد کرتا ہوں

ندی سے دور کوسوں دور جسدم شام کی دیوی
ادا سے باندھتی ہے سیاہ ساری سرخ دھاری کی
مجھے اس وقت اندازِ محبت یاد آتے ہیں
میں تم کو یاد کرتا ہوں میں تم کو یاد کرتا ہوں

قمر کی روشنی میں جب فضائیں جگمگاتی ہیں
ندی کے سینۂ روشن پہ ناویں ڈگمگاتی ہیں
مجھے اس وقت اندازِ محبت یاد آتے ہیں
میں تم کو یاد کرتا ہوں میں تم کو یاد کرتا ہوں

فرشتے رقص میں آتے ہیں جسدم آسمانوں میں
چہکتے ہیں طیور نغمہ پیرا آشیانوں میں
مجھے اس وقت اندازِ محبت یاد آتے ہیں
میں تم کو یاد کرتا ہوں میں تم کو یاد کرتا ہوں

ستارہ کا پتہ

روشن بنارس

بنارسی ساڑیاں
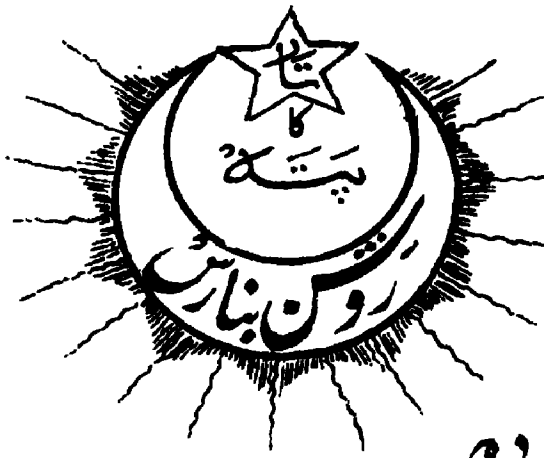
ہمارے یہاں بنارس کی تیار کردہ

زریں ساریاں وغیرہ ہر وقت مل سکتی ہیں۔ مال

کی عمدگی خوش معاملگی، ارزانی قیمت اور دیانتداری

کی وجہ سے ہماری فرم تمام ہندوستان

میں مشہور ہے

الحاج حافظ عبدالحکیم حاجی تاج محمد اینڈ کو

مدن پورہ بنارس